طوفانِ تبسّم

از

شوکت تھانوی

تبسم طوفان

از

شوکت تھانوی

جسے

منیجر صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے

باہتمام سید محمد علی حسین

یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کیا

بار دوم دو ہزار جلد — قیمت دو روپیہ (عہ)

سنہ ۱۹۴۲ء

فہرست مضامین

انتساب

جس طرح کسی کو کسی سے للّٰہی بغض ہوتا ہے بالکل وہی حال

میری عقیدت کا ہے کہ مجھ کو

رائٹ آنرایبل سر تیج بہادر سپرو

کی ذات سے کچھ ایسا گہرا تعلق ہے جس کو سوائے للّٰہی عقیدت کے

اور کچھ نہیں کہہ سکتا اور اسی عقیدت کو مستحکم بنانے کیلئے میں اس

مجموعہ کو آپ ہی کے نام نامی اسم گرامی سے منسوب کرتا ہوں ؎

زقدر و شوکتِ سپر د نہ گشت چیزے کم

کلاہ گوشۂ شوکت بآفتاب رسید

عقیدت کیش

شوکت تھانوی

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

از

جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی بی اے حیدرآباد

عدالتی مقدمات کی دو قسمیں ہیں، دیوانی اور فوجداری اسی طرح کتابوں کے مقدمات بھی دو قسم کے ہوتے ہیں، تعریفی اور تعارفی۔ تعریفی مقدمات صرف گزشتہ اہل قلم کی کتابوں پر لکھے جاتے ہیں اور اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خود اپنی تعریف کیجائے اور لوگوں کو بتایا جائے کہ

منم کردہ ام رستم داستاں
وگرنہ یلے بود در سیستاں

اس قسم کا مقدمہ لکھنے والے اللہ کے فضل سے ہندوستان میں بہت موجود ہیں۔

تعارفی مقدمہ اس لئے لکھا جاتا ہے کہ پبلک سے مصنف کا تعارف کردیا جائے اور اسکی تحریر کی خوبیاں ظاہر کرکے لوگوں کی جیبوں میں

ہاتھ ڈالا جائے۔

"طوفانِ تبسم" پر مقدمہ تعریفی لکھنے کی گنجائش ہی نہیں ہے کیونکہ بفضلہٖ تعالیٰ اس کے مصنف ابھی تک بقیدِ حیات ہیں اور خبر نہیں کہ کب تک زندہ رہیں، اب رہا دوسرے قسم کا مقدمہ یعنی مقدمہ تعارفی تو مجھے کیا کہنا، یوں بھی اس کتاب پر ایسی کوئی تحریر لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہے، ہندوستان کا کون پڑھا لکھا شخص ہے جو شوکت تھانوی کو نہ جانتا ہو اور ان کی تحریر کی خوبی سے واقف نہ ہو۔ ایسی صورت میں ان کے مجموعۂ مضامین پر کچھ لکھنا بجلی کے ہنڈے کے سامنے پیسہ کی دو والی موم بتیاں جلانا ہے ہاں اگر کچھ لکھا جاسکتا ہے تو اس پر لکھا جاسکتا ہے کہ آخر آج کل کے اہلِ قلم "کاما اور لے دوڑی" کیوں بنے ہوئے ہیں۔ ہماری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ زمانہ کے ہاتھوں اس دور میں سب پریشان ہیں۔ خاص کر اہلِ قلم کی تو یہ حالت ہے کہ :-

ہاتھ گلے نہ مٹھی ہلبلاتی اٹھی

بیچارے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتے ہیں جب رزق کا دروازہ کسی طرح نہیں کھلتا تو سوچتے ہیں کہ لاؤ بابا کوہم نے اپنی تحریر کا گرویدہ تو کر ہی

یاب ہے پھر انکی سے ٹکے کمائیں بس انکی وہی کیفیت ہے کہ مداری پہلے
ڈگڈگی بجا کر لوگوں کو اکٹھا کر لیتا ہے اس کے بعد [illegible] نے کمال دکھا کر ان کو
خوش کرتا ہے اور پھر چھڑی ہاتھ میں لیکر ہر ایک سے بتا پھرتا ہے کہ
" لاؤ پیسہ " اور سچ بھی ہے کہ بیچارے اہل قلم اس طرح نہ کریں تو کیا بھوکے
مر جائیں، ان غریبوں کے پاس لے دے کر اگر کوئی کارآمد چیز ہے تو وہ
ان کا دماغ ہے۔ اس دماغ کو رسالہ والوں نے اپنی ملک سمجھ لیا ہے۔
مضمون مانگنے کے لئے تو خط پر خط اور تار پر تار دئیے جاتے ہیں لیکن یہ کبھی
نہیں ہوتا کہ کسی خط کے ساتھ منی آرڈر بھی آجائے اور اس طرح بیچارے کو
تھوڑے ہی دنوں کے لئے روزی کی طرف سے اطمینان ہو جائے، جب
یہ صورت ہو تو مضامین کے مجموعے کیوں نہ چھپیں اور کیوں نہ پبلک پر ظلم کیا
جائے کہ اس کو خریدو، یہی وجہ ہے کہ آج کل اس قسم کی کتابوں کا بڑا زور
ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض اہل قلم تو اپنی کتابوں میں یونہی الا بلا ٹھونس
ٹھانس کر غلط سلط ٹکے کھڑے کر لیتے ہیں اور بعضوں کی کتابیں واقعی ایسی
ہوتی ہیں کہ ان کے خریدنے کو دل چاہتا ہے "طوفان تبسم" بھی ایک ایسی
کتاب ہے جس کو پڑھ کر شاید ہزاروں میں سے ایک بھی نہ کہے گا کہ " [illegible]

پسینے ڈوب گئے"

"طوفان تبسم" مقدا اللہ کیا عجیب و غریب نام ہے۔ "طوفان نوح" کے متعلق تو سنتے آئے ہیں کہ ایک بڑھیا کے تنور سے نکلا تھا لیکن یہ "طوفان تبسم" آخر کہاں سے اُٹھا، بڑی دیر تک سوچتا رہا۔ سوچتا رہا، آخر یہ سمجھ میں آیا کہ منھ بھی تنور کی شکل ہے اور "تبسم" ہمیشہ ہونٹوں ہی پر آتا ہے۔ شاید اسی مناسبت سے یہ نام تجویز کیا گیا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو "واللہ بڑی دور کی سوجھی"۔

اس مجموعے کے سارے مضامین خوش مذاقی میں ڈوبے ہوئے ہیں، میری ہمیشہ سے یہ رائے ہے کہ اس طرح کے مضامین لکھنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ شعر کی تعریف کی گئی ہے کہ جب وہ پڑھا جائے تو ہر شخص سمجھے کہ میں بھی ایسا شعر کہہ سکتا ہوں لیکن جب لکھنے بیٹھیں تو بڑے بڑے معجز نگار ہزاروں دفعہ قلم دوات میں ڈبوئیں اور ویسا ایک شعر نہ لکھ سکیں۔ بس یہی حال خوش مذاقی کا ہے۔ ہر شخص پڑھتے وقت سمجھتا ہے کہ "یہی میرے دل میں ہے" لیکن دل کی اس بات کو زبانِ قلم پر لانیوالے ڈھونڈھنے ہی سے کچھ ملیں تو ملیں دور کیوں جاؤ، خود اپنے ملک کی حالت ہی دیکھ لو یہاں

ہزاروں اخبارات اور سیکڑوں رسالے چھپتے اور بکتے ہیں اور شاید ہی کوئی پرچہ ہوگا جس میں خوش مذاقی کا ایک آدھ مضمون نہ ہوتا ہو لیکن بس رہنے ہی دیجئے۔

ہے ادب شرط منھ نہ کھلوائیں

یہ تو سب جانتے ہیں کہ تبسّم دو طرح پیدا کیا جاتا ہے ایک تو "شخصیت" (کیرکٹر) پیدا کرنے سے، دوسرے واقعات کو اس طرح بیان کرنے سے کہ خواہ مخواہ پڑھ کر ہنسی آئے، پہلی صورت کی زندہ مثال چارلی چیپلن اور دوسری کی ہیرلڈ لائڈ موجود ہے۔ ہر انسان میں ایسے پہلو موجود ہیں جن کا سلیقہ سے بیان کرنا لطف سے خالی نہیں ہوتا اور ہر واقعہ میں کوئی نہ کوئی صورت ایسی نکل سکتی ہے کہ اس کو خوش مذاقی کا رنگ دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کسی کا بیچ بازار میں گرنا کوئی ہنسی کی بات نہیں ہے فطرت کا تقاضا ہے کہ گرنے والے کی مصیبت پر اظہار ہمدردی کیا جائے لیکن اگر کوئی کالے صاحب سوٹ بوٹ سے آراستہ عینک لگائے سگرٹ پیتے، سیٹی بجاتے، بیت ہلاتے اور تمام بازار والوں کو اپنا زرخرید غلام سمجھتے ہوئے جا رہے ہوں اور ایک دفعہ ہی بیچ سڑک میں ان کا پاؤں

سچ بولتا ہوں گو کہ یہ عادت نہیں مجھے

خدا ان مجھے معاف کرے۔ میرے مضامین کے چوتھے مجموعہ کا دوسرا
ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔ طبع کر رہے ہیں اس کو مولوی محمد صدیق صاحب
مالک صدیق بک ڈپو لکھنؤ اور تباہ ہو رہا ہوں میں۔ مشق ناز ناشر صاحب
فرما رہے ہیں اور خون دو عالم میری گردن پر ہے کہ آپ کا فرحت تک نے
مجھ پر "کاتا اور لے دوڑی" کا الزام نہایت خوبصورتی کے ساتھ لگایا ہے
دراصل یہ الزام صحیح بھی ہے اور یہ ہے بھی ذرا چھچھوری سی بات کہ مصنف
کی زندگی ہی میں اس کی تصانیف کی ریل پیل شروع ہو جائے، دراصل ہونا
یہ چاہیئے تھا کہ جس طرح اگلے وقتوں کے مصنف اپنی زندگی تک اپنی تصانیف
کو طباعت سے محفوظ رکھا کرتے تھے اور ان کے انتقال یا وصال کے بعد انکی
تصانیف یتیم خانہ کے بچوں کی طرح قطار در قطار بازار میں نظر آتی تھیں بالکل
اسی طرح اس سلسلہ تبسم کو بھی میرے بعد ہی طبع ہونا چاہیئے تھا مگر دراصل

یہ سلسلہ ہے اُس پہلی غلطی کا جو پہلے مجموعہ موجِ تبسّم کو شائع کرنے کے سلسلہ میں میرے طفلانہ ذوقِ نام و نمود سے اُسوقت سرزد ہوئی جب صاحبِ تصنیف بنجانے کا شوق تڑپا رہا تھا اور مصنّفوں کی صف میں نظر آنے کا ارمان عشق کی حد کو پہنچا ہوا تھا۔ اس پہلی غلطی کا احساس کچھ دنوں کے بعد ہو گیا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا اور تیر اندازی نے پیشہ کی صورت غیر ارادی طور پر حاصل کر لی تھی میری اس خامکارانہ غلطی کو اگر کوئی عبرت کا سبق مل جاتا تو شاید یہ سلسلہ وہیں پر ختم ہو جاتا مگر ہوا اس کے برعکس، اس غلطی کو سراہا گیا، میری حوصلہ افزائی ہوئی اور آخر کار موجِ تبسّم پڑھنے والوں کے اصرار سے مجبور ہو کر ناشر صاحب نے دوسرے۔ پھر تیسرے اور پھر چوتھے مجموعہ کی طلب۔ طلب پر اصرار۔ اور اصرار میں شدت کے تمام مدارج طے کر کے زبردستیاں شروع کر دیں یہاں تک کہ موجِ تبسّم کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا، بحرِ تبسّم کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا، اور اب انہی ناشر صاحب یعنی مولوی محمد صدیق صاحب نے طوفانِ تبسّم کا دوسرا ایڈیشن چھاپنا شروع کر دیا ہے۔

طوفانِ تبسّم کا پہلا ایڈیشن جس کو دراصل میں نے خود نہیں بلکہ ایک ایسے بزرگ محترم نے شائع کرایا تھا جن کا نام میرے دل میں محفوظ ہے مگر اظہار کی

اجازت اب تک نہیں، البتہ میں برادر محترم مولوی محمد عثمان صاحب احمدی کا نام ڈنکے کی چوٹ پر لے سکتا ہوں جن کی پیہم کوششوں سے سیلاب تبسّم کے بعد ہی طوفان تبسّم کی اشاعت کا انتظام ہو گیا تھا اور یہ طوفان دراصل اُن ہی کا برپا کیا ہوا تھا اب اس کی تجدید مولوی محمد صدیق صاحب فرما رہے ہیں، اس لئے کہ عرصہ سے طوفان تبسّم بازار میں نظر نہیں آتا اور بغیر اس کے سلسلۂ تبسّمات نامکمل ہے۔ میں نے اس دوسرے ایڈیشن میں دانستہ طور پر اُن خامیوں کو من وعن رہنے دیا ہے جو اب مجھ کو محسوس ہوئیں اس لئے کہ خیال یہ بھی ہے کہ شاید وہ خامیاں اب اس لئے نظر آتی ہوں کہ میں خود کچھ پختہ ہو گیا ہوں مگر چونکہ پختگی کا تعلق مزاح سے بہت کم ہے لہٰذا میری پختہ کاری کو اس کا کیا حق حاصل ہے کہ وہ میری نوجوان خامیوں کو اب روبہ اصلاح کرے۔ البتہ طوفان تبسّم کے پہلے اڈیشن میں میری طرف سے جو عرضِ حال تھا اس کو اس لئے ضرور بدلنا پڑا ہے کہ حالات بدل چکے ہیں، واقعات وہ نہیں رہے ہیں جو پہلے تھے اور یہ بھی خیال ہے کہ اس نئے اڈیشن میں کوئی بات تو نئی ہو۔ بہرصورت اس مجموعہ میں اگر آپ کو کوئی خامی نظر آئے تو آپ اس کو اب سے نو سال

پہلے کی طفلانہ خامی سمجھئے گا، کوئی خوبی نظر آئے تو میں آداب عرض کرتا ہوں
کتابت و طباعت کے سلسلہ میں صدیق صاحب سے مراسلت کیجئے بلکہ یہ بھی
دریافت کیجئے کہ کاغذ کے اس قحط کے زمانہ میں اس دوسرے اڈیشن
کی طباعت کا یہ ذوق جس دل گردہ کے ساتھ انھوں نے فرمایا ہے
ان کا وہ دل اور گردہ انشیورڈ بھی ہے یا نہیں؟

شوکت تھانوی

۲۶ جنوری سنہ ۱۹۴۲ء

ٹائیگر

میں نے کہا "شوں"
بیگم نے کہا "اوں"

ٹائیگر میرے قدموں پر پڑا ہوا زبان نکالے ہانپ رہا تھا اور بیگم صاحبہ کے قدم معہ جوتوں کے مسہری پر رکھے ہوئے تھے انھوں نے چیں بجبیں ہو کر کہا "مجھے نہیں اچھا معلوم ہوتا۔"

میں نے پیار سے ٹائیگر کو دلار سے دیکھتے ہوئے کہا "کون؟ میرا ٹائیگر؟" جل کر کہنے لگیں "ہاں یہی موا۔ اسے یا تو باہر ہی رکھا کیجئے نہیں تو کسی دن میرے ہاتھوں اس کی موت آجائے گی"۔

میں نے دانتوں میں انگلی دبا کر کہا "اے بیگم یہ کیا کہہ رہی ہو، تم کو اگر ٹائیگر کے احساسات اور جذبات کا احترام نہیں ہے تو تم سے کم میرا ہی خیال کرو کہ مجھ کو کتے کی شان میں تمہارا یہ گستاخیاں کس قدر بری معلوم ہوتی ہوں گی۔ اسقدر عالی خاندان کتا، اسقدر قیمتی جانور اس قدر

وفا شعار رفیق اور اس کو تم اس طرح برا بھلا کہتی ہو؟"

جلبلا کر بولیں "ہاں میں تو اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ اس موئے موذی کو کہوں گی، اگر آپ کو اپنے کتے کا ایسا ہی خیال ہے تو اس کو باہر رکھا کیجئے، گھر میں آیا تو ٹانگ توڑ دوں گی"۔

معلوم نہیں بیگم کی اس بد اخلاقی پر ٹائیگر اپنے دل میں کیا کہتا ہوگا، بہر حال خود ہم کو اپنے معزز کتے کی اس کھلی ہوئی توہین پر قلبی اذیت ہوئی اور ہم فوراً "آؤ بیٹا"، کہہ کر ٹائیگر کو ساتھ لئے ہوئے باہر چلے گئے اور یہ طے کر کے کہ آج سے بیگم کو ٹائیگر سے پردہ کرائیں گے، چوکیدار سے کہہ دیا کہ دیکھو ٹائیگر کو باہر ہی رکھا کرو، اندر نہ جانے پائے اور جب ہم نہ ہوا کریں تو اس کو باندھ دیا کرو"۔

اس دن کے بعد سے ٹائیگر کبھی اندر نہ گیا، بیگم کو تو اطمینان تھا لیکن ہم کو اس خانہ جنگی اور فرقہ وارانہ باہمی اختلاف سے سخت تکلیف تھی، ہم چاہتے یہ تھے کہ گھر پر آکر اپنے رفیق ٹائیگر اور اپنی رفیقہ حیات دونوں سے بیک وقت دلچسپی لیں، لیکن بیگم کی ضد نے ہم کو مجبور کر دیا تھا کہ ہم گھر کے اندر کچھ وقت گزاریں اور کچھ ٹائیگر کے پاس گھر کے باہر۔

مختصر یہ کہ جس جھگڑے کی وجہ سے ہم ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کے مخالف تھے وہی جھگڑا بغیر دوسری شادی کئے ہوئے ہمارے گھر میں موجود تھا، پھر بھی ہم مناسب موقع کی تلاش میں تھے کہ بیگم کو سمجھا بجھا کر ٹائیگر سے مصالحت کرا دیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ گھریلو اختلاف ختم ہو جائے۔

ایک دن صبح کے وقت میز کی ایک طرف بیگم بیٹھی تھیں اور دوسری طرف ہم چائے نوشی کے ساتھ ساتھ بیگم کو خوش اخلاق اور ہنس مکھ پا کر ہم نے ٹائیگر کا مسئلہ چھیڑ دیا اور اس سنہرے موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے مگر بیگم نے کہا۔

آخر آپ کو یہ مُوا کتا کیا پسند ہے، مجھ کو تو صورت دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا ہے"۔

ہم نے کہا "میں سمجھتا تھا کہ آپ اس کو مذہباً گھر کے باہر رکھنے پر مُصر ہیں، آج معلوم ہوا کہ آپ محض ڈرتی ہیں"؟

جلدی سے کہنے لگیں "ہاں مذہباً بھی کُتا گھر میں رکھنا کوئی ثواب نہیں ہے"۔

ہم نے کہا "ایک بات بتائیے کہ آپ ڈرتی ہیں یا مذہباً کتّے کو الگ رکھنا چاہتی ہیں؟"

کہنے لگیں "دونوں باتیں ہیں، موئے کی صورت بھی تو کیسی خوفناک ہے"۔

ہم نے کہا نہیں تو اس کو تو بڑی بڑی یوروپین عورتیں دیکھ کر ہزار جان سے عاشق ہو جاتی ہیں اور بڑے بڑے کتّوں کے ماہرین کی رائے یہ ہے کہ مجھ کو خوش قسمتی سے ایسا کتا مل گیا ہے، اس کا شجرہ اگر تم دیکھو تو تم کو پتہ چلے گا کہ کتنا عالی خاندان اور نجیب الطرفین ہے"۔

بیگم نے منھ چڑھا کر کہا "آگ لگے اس موئے کی شرافت میں اور جھاڑو پھرے اس کی صورت پر، میں تو یہ کہتی ہوں کہ آپ اس سے بلّی پال لیتے، مجھ کو بلّی اچھی لگتی ہے اور وہ ناپاک بھی نہیں ہوتی"۔

ہم نے ہنس کر کہا "بلّی"؟

آواز آئی "کھل گیا، کھل گیا"۔

اور بیگم گھبرا کر اس طرح کرسی سے اٹھ کر میز پر پھاند پڑیں کہ ایک بھونچال آگیا، چائے کے کچھ برتن زمین پر گر کر ایک کے دس دس ہو گئے اور

کیتلی مع دودھ دان کے ہماری گود میں اس طرح آرہی کہ ہم بھی ناچ گئے۔ البتہ ٹائیگر صاحب کرسی کے قریب زبان نکالے ہوئے کمر مٹکا مٹکا کر دُم ہلا رہے تھے اور میز پر چڑھی ہوئی بیگم کے منھ سے الفاظ تک نہیں نکلتے تھے۔ ہم بڑی دیر کے بعد سمجھ سکے کہ کیا واقعہ ہوا ہے اور جب حواس بجا ہوئے تو بیگم کی حماقت پر خاموش ہنسی ہنستے ہوئے ٹائیگر کا پٹہ پکڑ کر باہر چلے گئے۔

اس دن کے بعد سے ہم کو پورا یقین ہو گیا کہ بیگم اور ٹائیگر کے درمیانی اختلافات کو مٹانا ممکن ہی نہیں ہے، چنانچہ ہم نے پھر اسکی کوشش بھی نہیں کی، البتہ ہم کو یہ اندیشہ ضرور تھا کہ کہیں بیگم صاحبہ ہمارے عزیز از جان ٹائیگر کو زہر نہ دیدیں یا کسی نوکر کو رشوت دیکر اس کو قتل نہ کرا دیں، چنانچہ اسکے لئے تو ہم نے نوکروں کو آگاہ کر دیا تھا کہ اگر ٹائیگر کا بال بھی بیکا ہوا تو ملازموں میں سے کوئی بھی پھانسی سے نہ بچ سکے گا لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ بیگم کو بھی اس عذاب جہنم سے ڈرا دیں جو کتے کو قتل کرنے یا قتل کرانے یا زہر دینے یا زہر دلوانے کے بعد خدا کے یہاں انسان پر ہوتا ہے، چنانچہ ہم نے بیگم سے کہا۔

"اب ٹائیگر کے لئے باقاعدہ انتظام کر دیا ہے کہ وہ کبھی گھر میں نہ آنے پائے"۔

بیگم نے کہا۔ "اب کی آیا تو اسکی قضا بھی آجائے گی"۔

ہم نے کہا۔ نہیں، اب وہ نہیں آئے گا، مگر دیکھیے کہیں آپ یہ حرکت نہ کر بیٹھیے گا کہ اس بے زبان جانور کو زہر دیکر مار ڈالیں، اس لئے کہ بڑا گناہ ہے"۔

بیگم نے لاپرواہی سے کہا۔ "ہاں کتّے کو مار ڈالنا گناہ ہے، اور کتّے کو پالنا تو گویا ثواب ہی ہے"۔

ہم نے وحشت ناک صورت بنا کر کہا۔ نہیں واقعی کسی بے زبان جانور کو مار ڈالنا تو ایسا گناہ ہے کہ اس کا عذاب جیتے جی گھر بھر کو بلکہ خاندان بھر کو ملتا ہے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ میر کاظم علی نے اپنے کتّے کو مار ڈالا اس بے زبان کا ایسا صبر پڑا کہ پہلے تو اسی ہفتہ میں انکا جوان لڑکا مرا، پھر دوسرے ہفتہ میں جوان لڑکی مع نواسے کے ختم ہوئی تھوڑے ہی دنوں کے بعد داماد مر گئے، پھر بیوی نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دی بلکہ مرتے وقت کتّے کی صورت ہو گئی تھی اور ابھی تین چار دن ہوئے

کہ وہ بیچارے خود مرے ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ ان کا دم بالکل کتے کی طرح نکلا ہے بلکہ وہ بھونک بھی رہے تھے۔

بیگم نے خوف کے مارے جھرجھری لیکر کہا "یا اللہ توبہ ہے"

ہم اپنی کامیابی پر دل میں خوش ہوئے اور کہا "واقعی توبہ کا مقام ہے۔ بے زبان جانور کو مار ڈالنا اچھا نہیں ہوتا"

بہرحال اس برمحل ترکیب سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ بیگم صاحبہ نے قتل ٹائیگر سے ہاتھ اٹھالیا لیکن وہ یہ برابر کہتی رہیں کہ "اگر گھر میں آیا تو ٹانگ توڑ دوں گی"۔

ہم نے کہا "ہاں اگر تم خود ٹانگ توڑنے کی ہمت رکھتی ہو تو میں ابھی ٹائیگر کو حاضر کرتا ہوں"۔

بیگم نے جلدی سے کہا "دیکھئے آپ کو خدا کی قسم جو لائے"۔

ہم نے کہا "نہیں آپ شوق سے ٹانگ توڑیں" اور یہ کہہ کر باہر کی طرف بڑھے۔

بیگم نے ہاتھ پکڑ کر کہا "دیکھئے اچھا نہ ہوگا"

اور ہم ہنستے ہوئے دفتر چلے گئے۔

دفتر سے واپس آکر سب سے پہلے ٹائیگر کی کوٹھری میں گئے لیکن وہاں ٹائیگر کا کہیں پتہ نہ تھا، دل دھک سے ہو گیا کہ ہو نہو آج بیگم نے اس بے زبان کو خدا جانے کس عذاب میں مبتلا کیا ہوگا، معلوم نہیں مار ڈالا یا کہیں چھڑوا دیا گیا، بہرحال اب ہم کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ ہم سے بچھڑا ہوا ٹائیگر اب ہم کو نہ ملے گا، بیگم کے ظلم پر غصہ آرہا تھا اور دل چاہتا تھا کہ ہم بھی گھر میں نہ جائیں، چوکیدار سے پوچھا تو وہ گدھا فوراً دوڑ کر کوٹھری میں گھس گیا جہاں ہم خود دیکھ چکے تھے کہ ٹائیگر نہیں ہے اور وہاں سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہو گیا، ہم نے ڈانٹ کر پوچھا "کہاں ہے ٹائیگر"؟

کہنے لگا "حضور ابھی یہیں تھا"۔

ہم نے گھونسہ تان کر کہا "تو کیا ہوا اب تو نہیں تو جان لے لونگا"۔

کہنے لگا "حضور ابھی میں نے اس کو دودھ دیا تھا، کوئی پانچ منٹ ہوئے"۔

ہم نے کہا "کیا تجھ سے بیگم نے اس کو کہیں چھڑوایا نہیں"؟

کہنے لگا "نہیں حضور"۔

ہم نے کہا "اچھا ٹھہرو تم ابھی ہیں بتاتا ہوں" اور ہم خود زن زناتے ہوئے گھر کے اندر گئے کہ آج ٹائیگر کی دشمنی کا بدلہ لیں گے اور خود بھی اس گھر سے چادر منہ اٹھے گا چلے جائیں گے لیکن گھر میں جا کر عجیب نقشہ دیکھا، ٹائیگر صاحب تو نہایت متانت سے بیچ صحن میں کھڑے ہوئے دم ہلا رہے تھے اور بیگم صاحبہ لاپتہ تھیں۔ ہم نے آواز دی۔

"آپ کہاں ہیں"؟

جواب آیا "ہٹائیے اس موذی کو"۔

ہم نے پھر آواز دی۔ "آخر آپ ہیں کہاں، میں نے اس کو پکڑ لیا ہے"۔

جواب آیا "نہیں اس کو پہنچا دیجئے"۔

اب جو ہم دیکھتے ہیں تو غسلخانہ میں اندر سے زنجیر لگی ہوئی ہے ہم نے ٹائیگر کو باہر پہنچا کر چوکیدار کے سپرد کر دیا اور فوراً اندر آ کر کہا۔

"ٹائیگر باہر گیا اب آپ نکلئے"

بیگم بالکل ٹائیگر کی طرح ہانپتی ہوئی غسلخانہ سے اس طرح برآمد ہوئیں کہ نہ پیر میں جوتہ، نہ سر پر دوپٹہ۔ ہم نے کہا "آخر یہ بھی کوئی

وحشت ہے، چوکیدار کو بلوا کر ٹائیگر کو باہر بھجوا دیا ہوتا"۔
کہنے لگیں "جی ہاں باہر بھجوا دیا ہوتا، وہ موا ایک دم سے سر پر آ گیا، میں بیٹھی ہوئی میز پوش کی جھالر بن رہی تھی کہ اس موے کے ہانپنے کی آواز آئی، اب جو منھ اُٹھا کر دیکھتی ہوں تو وہ بالکل سر پر کھڑا ہوا تھا، میرا تو دم ہی نکل گیا، آپ آج ہی اس کو گھر سے نکالئے نہیں تو میں کسی دن مر جاؤں گی"۔

ہم نے بھی جب سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ یہ صورت نبھنے والی نہیں ہے، چنانچہ اب ٹائیگر تو ہمارے دوست مسٹر اسکاٹ کے یہاں ہے جن کی بیوی کو اس سے اسقدر محبت ہے کہ شاید مسٹر اسکاٹ سے بھی نہ ہو گی اور ہمارے گھر میں بھی امن ہے بلکہ ہم میاں بیوی کے تعلقات اب پہلے سے زیادہ خوشگوار ہیں، معلوم ہوا کہ ٹائیگر ہم دونوں کے درمیان ایک وسیع خلیج کی حیثیت رکھتا تھا۔

سناؤں تمہیں بات اک رات کی

واللہ میں بُزدل نہیں ہوں نہ لکھنؤ میرا وطن ہے بلکہ میرا تعلق تو اُس خاندان سے ہے جس کی بہادری کے افسانے آج تک بُزدلوں کو بہادر بنانے کے کام میں آتے ہیں لیکن بعض واقعات ہی ایسے ہوتے ہیں کہ بڑے سے بڑا بہادر بھی لرزہ براندام ہو جائے بلکہ ہمارا تو خیال یہ ہے کہ جو واقعہ ہم پر گزرا ہے اگر کسی اور بہادر انسان پر گزرتا تو شاید وہ دہل کر مر جاتا یا سہم کر عرصہ تک اختلاج قلب وغیرہ میں مبتلا رہتا لیکن ہم نے اس آزمائشی اور امتحانی موقع پر اپنے ہوش و حواس کو اس حد تک قائم رکھا کہ نہ تو خوف کی وجہ سے دم نکلا اور نہ اختلاج قلب کی شکایت مستقل طور پر پیدا ہوئی، البتہ گھگی ضرور بندھ گئی تھی خیر یہ کوئی ایسی بُزدلی کی بات نہیں۔

قصہ یہ ہوا کہ لکھنؤ میں مسلح ڈاکوؤں کی کثرت نے ایک تو یونہی سب کو ڈرا رکھا تھا اس پر طرہ یہ کہ کسی اللہ کے بندے نے ایک خط بھی ہم کو بھیجدیا کہ اگر جان کی خیریت چاہتے ہو تو ایک ہزار روپیہ ہمارے نذر کر دو، ورنہ مقابلہ

کیلئے تیار ہو جاؤ' اس خط کو دیکھ کر پہلے تو تھوڑی دیر کیلئے ہم کو بھی محسوس ہوتا رہا کہ واقعی قلب کی حرکت بند ہونے والی ہے لیکن پھر ہم نے اس بزدلی پر دل ہی دل میں خود ہی اظہار تنفر کیا اور مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے وہ خط لیکر بیگم کے پاس پہونچے تاکہ ان کو بھی یہ الٹی ٹیم دکھا کر خطرہ کیلئے تیار کر دیں' لیکن بیگم ٹھہریں عورت ان کا خط دیکھتے ہی گویا دم نکل گیا' ایک دم سے زرد پڑ گئیں اور ڈرتے ڈرتے بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگیں "پھر؟"

ہم نے بہادرانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "پھر کیا دیکھا جائے گا"

بیگم نے ہکا بکا ہو کر کہا۔ "دیکھا کیا جائیگا؟ مجھ کو اور بچوں کو لیکر آج ہی زرد کوٹھی چلئے میں اب یہاں ایک منٹ نہ ٹھہروں گی"

ہم نے بیگم کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں میں آج ہی تمام زیور اور روپیہ بنک میں رکھوائے دیتا ہوں اور ایک پہاڑی بند و قچی پہرہ دینے پر نوکر رکھے لیتا ہوں"

بیگم نے اس تجویز سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔۔

"اس سے کیا ہوگا اگر ڈاکوؤں کو روپیہ نہ ملا تو وہ جان لیں گے' بنک میں روپیہ رکھنے سے کیا فائدہ ہوگا؟"

ہم نے کہا۔ "مگر بنک میں ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے کہ میں آپ کو اور بچوں کو بھی وہیں رکھوا دوں، ہم سب کی حفاظت خدا کریگا"۔

بیگم ہیں ذرا مذہبی قسم کی آدمی، خدا کا نام سُن کر دل سے نہ سہی، مگر اخلاقاً اس انداز سے چُپ ہوگئیں کہ گویا اطمینان تو نہیں ہوا ہے مگر مجبوری کا نام شکر ہے، بہرحال ہم واقعی صرف یہی کر سکتے تھے کہ روپیہ اور زیور بنک میں رکھوا دیں اور پہرہ دار نوکر رکھ لیں، اس کے علاوہ ہم نے یہ بھی کیا کہ وہ دہشت انگیز خط جو ہم کو موصول ہوا تھا پولیس میں بھجوا دیا اور اس کے بعد اپنے کو مع بال بچّوں کے خدا کو سونپ کر بیٹھ رہے۔

جس روز کا یہ واقعہ ہے اُس دن چراغ میں بتّی پڑتے ہی ہمارا تمام گھر مقفل کر دیا گیا، پہرہ دار خاص ہمارے کمرے کے دروازے پر تعینات کر دیا گیا اور کمرے کے اندر بھی یہ انتظام تھا کہ خود ہماری چارپائی پر توشک کے نیچے بندوق تھی اور تکیہ کے نیچے کارتوس، بیگم نے اپنے دونوں بچّوں کو اُن کے بستروں کے بجائے خود اپنے پاس لٹایا تھا اور یہ طے کر لیا تھا کہ تمام رات کوئی نہ سوئے گا، حالانکہ بغیر طے کئے بھی نیند کا آنا ذرا مشکل ہی تھا بہرحال شام ہی سے ہم سب اس طرح کیل کانٹے سے لیس ہو کر بیٹھ گئے کہ

گویا کسی کی آمد آمد ہے۔

رات کا ابتدائی حصہ بخیریت تمام گزر گیا اور ۱۲ بجے رات تک سڑک پر آدمیوں کی اور سواریوں کی آمد و رفت سے چہل پہل رہی لیکن اس کے بعد رفتہ رفتہ سناٹا ہونے لگا یہاں تک کہ ایک ہُو کا عالم ہو گیا، رات کی بھیانک تاریکی اور دہشت ناک سناٹا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہم سب کو نگل جائیگا اور بغیر ڈکار لئے ہضم کر جائے گا، اس وقت گویا ہم تاریک رات کے بھیانک سیاہ دیو کی آغوش میں تھے کہ وہ جب چاہے ہم کو اُٹھا کر منھ میں رکھ لے، اس خوفناک سکوت کو اس طرح توڑا جا سکتا تھا کہ ہم بیگم سے باتیں کرتے اور بیگم ہم سے لیکن دونوں اس قیمتی وقت کو فضول بک بک میں ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اپنی اپنی جگہ پر یہی سوچ رہے تھے کہ جب ڈاکو آئیں گے تو ہم ان کا خیر مقدم کس طرح کرینگے؟ جب وہ ہم کو پستول دکھائینگے تو ہم کس طرح ہاتھ اُٹھا کر اعلان شکست کریں گے اور جب وہ ہم سے روپیہ طلب کرینگے تو ہم کس طرح اپنی ناداری اور مفلسی کا ان کو یقین دلائیں گے پھر اگر خدانخواستہ ان ظالموں نے ہم کو قتل وغیرہ کیا تو کیا ہوگا"

پہرہ دار نے نہایت ڈراونی آواز سے کہا "ہاہ ..... ہو"

ہم تو خیر چھ سات انچ اُچھلے ہوں گے کہ بیگم غڑاپ سے لحاف کے اندر گھس گئیں اور سانس روک کر رہ گئیں، اس حماقت کا احساس ۵ منٹ بعد ہم کو اور سات منٹ بعد اُن کو ہوا مگر اسکے باوجود نہ تو ہنسی آئی اور نہ دونوں میں سے کسی نے اس پر کوئی تبصرہ کیا بلکہ پھر اس طرح بیٹھ گئے

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی

اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

یعنی سکوت کا یہ عالم تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن نہایت صاف سُن رہے تھے اور ذرا ذرا سے کھٹکے پر یہ آواز اور بھی تیزی کے ساتھ ڈبل مارچ کرتی ہوئی سُنائی دیتی تھی، ہم نے اس مہمل بزدلانہ خاموشی پر خود ہی جو غور کیا تو کچھ شرم سی آنے لگی لہذا یہ طے کیا کہ کوئی کتاب پڑھ کر یہ وقت کاٹا جائے مگر سوال یہ تھا کہ کتاب تھی میز پر اور چارپائی تھوڑے سے فاصلہ پر، لہذا یہ کیوں کر ممکن تھا کہ ایسے نازک موقع پر ہم چارپائی سے اُٹھتے اور میز تک جا کر وہاں سے کتاب لاتے اور فرض کر لیجئے کہ ہم اس طرح اپنے کو خطرے میں ڈال بھی دیتے لیکن اگر اسی وقت کوئی آجاتا تو بڑی مشکل ہوتی لہذا یہ ارادہ ملتوی کرنا ہی پڑا اور یہی

مناسب معلوم ہوا کہ بیگم سے باتیں کریں چنانچہ اس اسکیم کے نشیب و فراز پر خاموشی کے ساتھ خوب اچھی طرح غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ اگر چپکے چپکے باتیں کی جائیں تو چنداں مضائقہ نہیں ہے لہذا تھوڑی دیر تک ارادہ کرنے کے بعد ہم نے کہا:۔

"بیگم"

بیگم نے زیر لب کہا "ہوں"۔

ہم نے کہا "جاگ رہی ہو نا"

بیگم نے پھر اسی طرح بغیر منھ کھولے ہوئے کہا "ہوں"۔

ہم نے چپکے سے کہا "ڈرنا نہیں ہم جاگ رہے ہیں"

بیگم نے اس کا جواب دینا کچھ ضروری نہیں سمجھا اور ہم بھی سوچنے لگے کہ اب کیا کہیں کیونکہ ہم کو زیادہ غور کرنے کی مہلت ہی نہ رہی اس لئے کہ چار پانچ بلکہ اس سے بھی زیادہ کتوں نے آواز ملا کر خوفناک طریقہ پر بھونکنا شروع کیا اور ان کے بھونکنے سے قدرتی طور پر ہم کو اس نتیجہ پر پہنچنا پڑا کہ ضرور کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے غالباً یہی فیصلہ بیگم صاحبہ نے بھی کیا، اس لئے کہ چپکے سے انھوں نے پوچھا:۔

"کتے کیوں بھونک رہے ہیں؟"

ہم نے کہا۔ "معلوم نہیں"۔

بیگم نے کانا پھوسی کے انداز سے پوچھا۔ "چوکیدار سو گیا؟"

ہم نے رازدارانہ طریقہ پر جواب دیا۔ "معلوم نہیں"۔

بیگم نے کہا۔ "اس کو آواز دیجئے"۔

ہم نے کہا۔ "ابھی چپ رہو کتے ذرا چپ ہو جائیں"۔

مگر سوال یہ تھا کہ کتے واقعی کیوں بھونک رہے ہیں یقیناً انھوں نے کسی اجنبی آدمی کو اس طرف آتے ہوئے دیکھا ہے اور کیا تعجب ہے کہ وہ آدمی ڈاکو ہو اب خطرہ نزدیک تھا اور خطرہ کے نزدیک ہونے کی یہ علامت بھی پائی جاتی تھی کہ ہمارے دل کی حرکت سول سروس کپ کی ریس بن گئی تھی اور ہاتھ پیر ذرا کانپ رہے تھے، کتے بدستور بھونک رہے تھے بلکہ بھونکتے ہوئے عین ہمارے مکان کے سامنے آ گئے تھے کہ ناگاہ

"آہ —— ہاؤ —— ہا ہا"

اب کے ہم بھی بیچارے ہیں گر پڑے اور معلوم نہیں کہ "اوئی" کہہ کر بیگم کا کیا حشر ہوا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد آواز آئی :۔

"جاگتے رہو"۔

ہم بھی سنبھل کر بیٹھ گئے اور بیگم بھی لیکن کُتّے بدستور قیامت برپا کئے ہوئے تھے بیگم نے بھرائی ہوئی آواز میں پھر کہا:۔

"یہ کتّے کیوں بھونکے جاتے ہیں؟"

ہم خود ہی اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھے، آخر ہم نے ہمت کر کے چوکیدار کو چپکے سے پکارا اور پوچھا کہ "یہ کتّے کیوں بھونک رہے ہیں؟"

اس نالائق نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "انکا اور کام ہی کیا ہے؟"

ہم نے اس مہمل جواب سے جل کر مگر خوشامدانہ انداز سے کہا:۔

"پھر بھی آخر بات کیا ہے؟"

اس پہاڑی گدھے نے پھر وہی مہمل جواب دیا کہ "حضور اگر وہ بھونکیں نہ تو کتا ان کو کون کہے؟"

ہم جل بھن کر چپ ہو رہے اس لئے کہ زیادہ بات چیت کرنا بھی موقع اور محل کے اعتبار سے مناسب نہ تھا لیکن کتوں کا بھونکنا یقیناً بلاوجہ نہیں ہوسکتا اور پھر عین ہمارے دروازہ پر کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی بہرحال ہم زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ اپنا کانپتا ہوا ہاتھ چپکے سے

اُٹھاکر بستر پر اس جگہ رکھ لیا جہاں بستر کے نیچے بندوق رکھی ہوئی تھی مگر
اب ہم کو معلوم ہوا کہ بندوق اس قسم کے موقعوں کیلئے بالکل بیکار چیز ہے،
اس لئے کہ اس کمبخت کیلئے یہ ضروری بات ہے کہ اسکو چلایا بھی جائے تو
چلے اور یہاں سوال یہ درپیش تھا کہ آخر چلائی کس طرح جائیگی اور کس کا فرسے
چلائی جائیگی، ہماری نشانہ بازی مسلّم، ہماری بندوق بازی کی مہارت تسلیم لیکن
جناب ڈاکو کوئی ہرن یا نیل گائے، اور یا تیتر تو تھے نہیں کہ خاموشی سے
گولی کھاکر ڈھیر ہوجاتے یہاں تو برابر کا مقابلہ تھا کہ ایک گولی تم چلاؤ تو دس
گولیاں ادھر سے چلائی جائیں گی، پھر سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ بندوق
بھی بھری ہوئی نہیں تھی بلکہ بغیر بھری ہوئی چارپائی کے ایک طرف
رکھی ہوئی تھی اور کارتوس تکیہ کے نیچے تھے اس کے یہ معنی ہوئے کہ پہلے
بندوق بستر کے نیچے سے نکالی جائے پھر اس میں تکیہ کے نیچے سے کارتوس
نکال کر بھرے جائیں اسکے بعد اگر گھوڑا انگلی سے دب سکے تو بندوق چھوٹ
سکتی ہے ورنہ نہیں استغفر اللہ یہ بھی کوئی تفریحی شکار تھا کہ اسقدر اہتمام کے
بعد بندوق چلائی جاتی، مجبوراً ہم نے بندوق پر سے ہاتھ ہٹالیا اور دراصل
یہ ہماری ایمانی کمزوری بھی تھی کہ خدا کو بھول کر بندوق سے کوئی توقع

رکھتے چنانچہ بندوق سے مایوس ہو جانے کے بعد ہم نے اپنے ذہن میں
سوائے خدا کے اور کسی کو نہ رکھا اور واقعی اس خیال کے آتے ہی اسقدر
تقویت پیدا ہو گئی کہ ہم نے آزادی سے منہ کھول کر سانس لینی شروع کر دی
اور اسوقت پہلی مرتبہ داڑھ میں دبے ہوئے پان کو بھی چبایا بلکہ ایک آدھ
ڈگری بیگم کو بھی گردن گھما کر دیکھا کہ کس حال میں ہیں وہ اللہ کی بندی
دروازہ پر اس طرح نظریں جمائے ہوئے تھی کہ گویا اب دروازہ کھلا اور
اب کوئی آیا، خیر یہ تمام صورتیں تو جس طرح ہو سکتا تھا برداشت کی جا رہی
تھیں مگر اس مصیبت بالائے مصیبت کا کوئی حل ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا
تھا کہ اسی نازک موقع پر پیشاب نے بھی ستایا یہ دراصل ہماری ہی حماقت کا
نتیجہ تھا کہ مغرب کے بعد ہی پیشاب کر کے چارپائی پر آ گئے تھے ورنہ اگر ہم نے
اکل حصہ شب کے سناٹے میں ایک مرتبہ اور اس طرف سے فراغت کر لی
ہوتی تو اسوقت اس مصیبت کا سامنا نہ ہوتا، چارپائی سے اُتر کر غسل خانہ تک
یا کم از کم ناب دان تک جانا اور وہاں اس بھیانک رات کے سناٹے میں
بیٹھ کر تنہا پیشاب کرنا ظاہر ہے کہ ایک ناممکن اور ناقابل عمل سی بات تھی
یہی ایک صورت تھی کہ پیشاب کو روکا جائے لیکن یہاں تو یہ حال تھا کہ وہ

تمام تدابیر عمل میں لائی جا چکی تھیں جو اس قسم کے مواقع پر پیشاب کو روکنے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہیں، اتفاقاً عین اسی موقع پر ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ہم نے غسلخانہ جانے کا ارادہ بھی کیا تو بیگم خود ہی ہم کو نہ جانے دیں گی اور اگر ہم گئے بھی تو وہ خود ہمارے ساتھ چلیں گی بہر حال دونوں صورتوں میں ہمارا مقصد حل ہوا جاتا ہے، لہٰذا ہم نے بیگم سے کہا:۔

"سنتی ہو"۔

بیگم نے چپکے سے کہا "کیا ہے"؟

ہم نے کہا "پیشاب!"

بیگم نے اس اہم مسئلہ کو کوئی معمولی سی بات سمجھ کر کہا "اوتھ ہو گا بھی"

ہم نے کہا۔ "بڑے زور سے معلوم ہو رہا ہے بس اب نکلنے ہی والا ہے"۔

بولیں "۔ تو جاؤ پھر"۔

ہم نے حیرت سے کہا۔ "اور تم ڈرو گی تو نہیں"؟

بیگم نے کہا "۔ اگر اس وقت یہیں کر لو تو کیا ہرج ہے"؟

ہم نے اخلاقاً کہا۔ "یہاں؟ یعنی کمرے کے اندر؟ اجی نہیں بُرا معلوم ہوتا ہے"۔

بیگم نے کہا۔"ہوگا بھی، صبح کمرہ دُھل جائے گا"۔

ہم نے پھر کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا اسلئے کہ یہ بھی ممکن تھا کہ بیگم ہمت کر کے ہم کو باہر جانے کی اجازت دے دیتیں اور اسکا بھی امکان تھا کہ ناگہانی طور پر یہ ضرورت ہی باقی نہ رہتی، لہذا ہم نے نہایت اطمینان کے ساتھ چارپائی پر بیٹھے بیٹھے شاشیدن کا مصدر گردانا شروع کیا مگر کیا عرض کیا جائے کہ عین اسی موقع پر۔

"آ ـــــ خاہ ـــــ ہوہاؤ ـــــ خبردار"

کی فلک شگاف بھیانک آواز نے ہم کو مجبور کر دیا کہ پیشاب کا سلسلہ غیر ارادی طور پر باقی آئندہ کرتے ہوئے جوں کے توں ڈھلک کر لحاف کے اندر گھس رہے اور جب کچھ دیر کے بعد یہ اطمینان ہو گیا کہ یہ پہرہ دار نے اپنا فرض انجام دیا تھا تو ہم نے بھی لیٹے ہی لیٹے ازار بند کس لیا اور پیشاب کی دوسری قسط بھی ادا کرنے کا خیال نہ رہا، اسوقت تقریباً ڈھائی بجے تھے اور ڈاکوؤں کے انتظار کے باوجود نیند کا بھی غلبہ تھا بلکہ بیگم تو شاید بیٹھے ہی بیٹھے اونگھ بھی رہی تھیں مگر ہم سونا نہیں چاہتے تھے اسلئے کہ اگر اسوقت سونے کا ارادہ کرتے تو یہ اندیشہ تھا کہ شاید پھر حشر سے پہلے

آنکھ نہ کھلے گی، مانا کہ پہرہ دار جاگ رہا تھا وہ اسی لئے نوکر رکھا گیا تھا کہ ہم اطمینان سے سوئیں اور وہ جاگتا رہے لیکن انسان ہی تو تھا اگر وہ بھی سو جاتا اور ڈاکو اتفاق سے آجاتے تو ظاہر ہے سیدھے ہمارے سینہ پر چڑھ جاتے اس وقت کیا ہوتا؟ اس خیال سے ہم جاگتے رہے بلکہ زبردستی جاگتے رہے جمائیاں آتی رہیں، انگڑائیاں لیتے رہے لیکن سو جانا خطرناک تھا البتہ چونکہ آنکھ بند کرنے میں ذرا لطف آتا تھا لہذا کبھی کبھی ایک ایک سکنڈ پھر چار چار سکنڈ۔

"پھر ــــ پھر ــــ پھر ــــ خرخرخر"

غالباً ابھی آنکھ لگی تھی کہ ڈاکو موقع پا کر چڑھ بیٹھا اور ہم اچھل کر جاگ پڑے، ڈاکو ہم پر لدا ہوا تھا اور ہم کلمہ پڑھ پڑھ کر جان دے رہے تھے، سانس تک روک لی تھی، آنکھیں بھینچ کر بند کر لی تھیں اور زندگی کی آس، آخری کشمکش پر موت کو ترجیح دے رہے تھے کہ یکایک ڈاکو نے کہا "او، او، او، او، او، او" اور ہم نے بھی غیر ارادی طور پر اس کی آواز سے آواز ملا کر کہنا شروع کیا "او، او، او، او" ہم لحاف کے اندر سے اور ڈاکو لحاف کے اوپر سے اسی متواتر اور مسلسل او، او میں

مصروف تھے بلکہ دونوں بچے بھی غالباً جاگ کر اس آواز میں شریک ہو گئے تھے اس لئے کہ نہایت مہین اور باریک آوازیں بھی اس راگ میں شامل تھیں، البتہ پہرہ دار نہایت کرخت آواز میں "کیا ہے؟ کیا ہے" کا شور بلند کئے ہوئے تھا آخر کار وہ دروازہ کھول کر کمرہ میں گھس آیا، پہلے تو زبانی "کیا ہوا، کیا ہوا؟" کرتا رہا، حالانکہ اندھا دیکھ رہا تھا کہ ڈاکو ہم پر سوار ہے، آخر کار ڈاکو کو ہم پر سے ہٹا کر کہا:۔

"بیگم صاحبہ چپ تو ہوئیے آخر ہوا کیا؟"

اب ذرا ہماری بھی گھگی پنچم سے مدھم کے سُروں پر آئی اور رفتہ رفتہ خاموش ہوئے، لحاف ہٹا کر دیکھا تو بیگم صاحبہ پہرہ دار کے پاس بدحواس کھڑی تھیں اور پہرہ دار دونوں بچوں کو اٹھائے ہوئے تھا پہرہ دار نے ہم سے پوچھا۔ "حضور آخر ہوا کیا؟"

ہم نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "ڈاکو مجھ پر چڑھ بیٹھا تھا۔"

بیگم نے کہا۔ "نہیں ڈاکو نہیں، میں آپ کے پاس آئی تھی ڈاکو تو باورچیخانہ میں جاکر برتن سمیٹ رہا تھا۔"

پہرہ دار نے فوراً لالٹین اٹھا کر باورچیخانہ میں جاکر دیکھا تو معلوم

ہوا کہ ڈاکو نے سوائے اس کے کوئی جرم نہیں کیا ہے کہ دودھ کی پتیلی گرا کر دودھ پھینک دیا اور پھر اس کو چاٹ بھی گیا۔

پہرہ دار نے کہا: "واہ، واہ، واہ"

بچّے ہنس دئیے۔

بیگم نے کہا: "توبہ ہے اللہ"۔

میں نے کہا: "لاحول ولاقوۃ اب کے یہ حرامزادی بلّی آئی تو گولی مار دوں گا"

اس کے بعد مُرغ اذان دے رہا تھا اور ہم سب سو رہے تھے۔

اشتہاری شادی

(۱)

ضرورت شادی

ایک تعلیم یافتہ، جوان العمر، خوبصورت، تندرست، برسر روزگار، حنفی المذہب مسلمان کو ایک شریف خاندان، تعلیم یافتہ، حسین باسلیقہ دوشیزہ سے عقد کی ضرورت ہے، لڑکی کی عمر ۱۶ اور ۲۰ سال کے درمیان ہو، تمام خط وکتابت صیغۂ راز میں رہے گی، مندرجہ ذیل پتہ پر خط وکتابت کیجائے۔

ع۔ معرفت اڈیٹر صاحب سرپنچ۔ لکھنؤ

یہ تھا وہ اشتہار جس کو دیکھتے ہی میر صاحب ایک دم سے چونک پڑے اور دو تین مرتبہ گھبرا گھبرا کر اشتہار کو شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد باورچیخانہ کی طرف منہ اُٹھا کر بولے:۔

"ارے سنتی ہو"؟

لیکن سیدانی کچھ اس انہماک سے دال بگھار رہی تھیں کہ انھوں نے کچھ نہ سُنا، میر صاحب نے ذرا تیز آواز میں پکارا۔

"کبھی تو سُن لیا کرو، چاہے جتنا ضروری کام ہو مگر تم کو اپنے ہانڈی چولھے ہی سے فرصت نہیں ہوتی"۔

سیدانی نے فوراً تمام کام چھوڑ دیا اور میر صاحب کے پاس آکر بیٹھ گئیں، میر صاحب نے ادھر ادھر دیکھ کر نہایت رازدارانہ طریقہ پر آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا:۔

واقعی خدا بڑا مسبب الاسباب ہے، بعض اوقات تو کنواں پیاسے کے پاس آجاتا ہے"۔

سیدانی نے خوش ہو کر پوچھا "کیا ہوا کیا؟ کچھ کہو بھی تو"۔

میر صاحب نے پھر ادھر ادھر دیکھا اور سیدانی سے قریب آنے کا اشارہ کر کے بولے "رُقن کہاں ہے"؟ سیدانی نے بھی ادھر اُدھر دیکھ کر کہا "شاید کوٹھے پر ہے کیوں"؟ میر صاحب بولے "دیکھو خداوند کریم نے گھر بیٹھے اس کی نسبت بھیجی ہے اور میرا دل تو یہی کہہ رہا ہے کہ یہ اشتہار صرف ہماری رُقن کے لئے چھاپا گیا ہے، ایسا اچھا لڑکا اگر

چراغ لیکر ڈھونڈھا جائے تو نہیں ملیگا، آجکل لڑکیاں تو بہت ہیں مگر اچھے اور شریف لڑکوں کا کال ہے"۔

سیدانی نے خوشی سے مخبوط الحواس ہو کر پوچھا "کیسی نسبت ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ کس نے بھیجی ہے؟ کچھ بتا بھی تو چکو"۔

میر صاحب نے چشمہ لگا کر اخبار اُٹھایا اور بولے۔ "سنو"۔

"ایک تعلیم یافتہ، جوان العمر، خوبصورت، تندرست، برسر روزگار یعنی نوکر، حنفی المذہب مسلمان لڑکے کے لئے ایک حسین، باسلیقہ، شریف خاندان کنواری لڑکی کی ضرورت ہے، لڑکی کی عمر سولہ [۱۶] اور بیس [۲۰] سال کے درمیان ہو"۔

بتاؤ اس سے اچھی نسبت اور کیا آئے گی، لڑکا پڑھا لکھا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ خدا کے فضل و کرم سے نوکر چاکر بھی ہے یہ نہیں کہ تمہاری لڑکی کو لیجا کر ماں باپ کے رحم و کرم پہ چھوڑ دے خود اپنے گھر کا مالک و مختار ہوگا، ماشاءاللہ تندرست بھی ہے، جوان بھی ہے اور ذات رات کا بھی اچھا ہے، بولو کیا کہتی ہو؟"

سیدانی نے تھوڑی دیر تک غور کرنے کے بعد کہا۔ "مگر ایک بات ہے"

میر صاحب نے بات کاٹ کر جھڑک دیا۔ "اب بات، وات کچھ نہیں ہے، مجھ کو اس نسبت میں کوئی عیب نظر نہیں آتا"۔

سیدانی نے پھر زور دیکر کہا۔ "سُن تو لیا کرو، میں یہ کہہ رہی ہوں کہ ان کو تو ضرورت ہے پڑھی لکھی، خوبصورت اور سولہ برس سے بیس برس تک کی لڑکی کی، اور ہماری رُقن اول تو پڑھی لکھی نہیں ہے پھر صورت وشکل میں جو عیب ہے وہ ظاہر ہے اور عمر بھی اس کی بیس سے زیادہ ہی ہے، پھر بھلا اس کی نسبت کیسے ہو سکتی ہے"؟

میر صاحب ان تمام باتوں کو پہلے ہی سے سوچ چکے تھے اور جانتے تھے کہ سیدانی یہی کہیں گی چنانچہ یہ سنتے ہی ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولے:۔

تم تو ہو بیوقوف معلوم ہوتا ہے کہ دھوپ میں بال سفید کئے ہیں، اری احمق اول تو یہ تمام باتیں ان کو معلوم ہی کیسے ہوں گی اور اگر شادی سے پہلے معلوم بھی ہو جائیں تو ہمارا کیا جائیگا، ان کو غرض ہوگی کریں گے نہیں تو اپنے گھر کا راستہ لیں گے اور تم جو یہ کہو کہ شادی کے بعد کیا ہوگا تو اس طرف سے تم اطمینان رکھو کہ شادی کے بعد ہماری رقن کی سادگی اور سیدھا پن ایکطرف اور دوسری طرف ہماری خاندانی شرافت وغیرہ ان تمام عیوب پر غالب آ جائیگی

اور وہ لڑکا بجائے ناخوش ہونے کے اپنی قسمت پر ناز کریگا، مجھ کو شادی

کے بعد کی تو کوئی فکر ہی نہیں ہے البتہ شادی کسی طرح جلد سے جلد ہو جائے

اب جوان لڑکی کو بٹھائے رکھنا میرے لئے موت سے بدتر ہے، آج

رات کو بھی نیند نہیں آئی جب تم اُٹھی ہو تو میں حقہ بھر رہا تھا"۔

سیدانی نے پھر کہا۔ "یہ شادی بیاہ کا معاملہ جلدی کا نہیں ہوتا،

اچھی طرح غور کر لو"۔

میر صاحب نے پھر بات کاٹ دی۔ "بکومت میں کچی گولیاں

کبھی نہیں کھیلتا، میں خوب غور کر چکا ہوں اور اب خط لکھے دیتا ہوں"۔

(۲)

الطاف غریب کی قسمت میں یہی لکھا ہوا تھا کہ شادیاں کرتے

جائیں اور بجائے گھر بسانے کے قبرستان بساتے جائیں۔ چنانچہ چھبیس

سال کے اندر اندر تین بیویاں تو مر چکی تھیں اور اب چوتھی کو مارنے کیلئے یہ

اشتہار دیا گیا تھا، اس اشتہار کے شائع ہوتے ہی لڑکی والوں کے خطوط

آنے شروع ہو گئے لیکن الطاف نے ان تمام خطوط میں اسی خط کا انتخاب

کیا تھا جو میر امجد علی نے سب سے پہلے بھیجا تھا۔ البتہ اب اس کو اپنا دل چورسا

محسوس ہو رہا تھا واقعہ یہ تھا کہ ہمارے الطاف صاحب کا جہاں تک
تعلیم کا تعلق ہے صرف اُردو مڈل پاس تھے لیکن میر امجد علی نے لکھا
تھا کہ ان کی لڑکی اُردو، فارسی، انگریزی اور عربی تک میں مہارت رکھتی
ہے شکل صورت کے اعتبار سے الطاف بیچارے تمام قصبہ میں مشہور تھے
اور اشتہار میں تو خیر انھوں نے یہ قید رکھ دی تھی کہ لڑکی خوبصورت ہو مگر
اب ڈر رہے تھے کہ میر امجد علی کی خوبصورت لڑکی مجھ کو دیکھ کر ڈر کر بیہوش
نہ ہو جائے، یہ میرا آبنوسی رنگ، یہ نقش و نگار والا چہرہ، یہ بڑے بڑے
دانت اور "کجامی نماید کجامی زند" والی آنکھیں دیکھ کر ایک حسین دوشیزہ کا
کیا حال ہوگا، پھر خود ہی سوچے کہ مرد کا حسین چہرہ کچھ ضروری نہیں ہے
اسکا حُسن یہی ہے کہ وہ بیوی سے محبت کرے اور اس معاملہ میں وہ اپنے کو
ہر طرح قابل اطمینان سمجھتے تھے، رہ گئی ملازمت تو ان کو اس طرف سے
بھی اطمینان تھا کہ آج نہ سہی کل سہی، بہر حال ملازم ضرور ہو جائیں گے
اور بیکاری ہمیشہ نہیں رہے گی، عمر کو کم کرنے کیلئے مصنوعی دانت اور
خضاب بازار میں نہایت آسانی کے ساتھ مل سکتے ہیں، خاندان کے
متعلق اُن کا دعویٰ تھا کہ کسی کو بھی یہ نہیں معلوم ہے کہ وہ جولاہے ہیں

مختصر یہ کہ ہر طرف سے اطمینان کرنے کے بعد اُنھوں نے خط لکھ دیا کہ مجھ کو ہر طرح یہ نسبت مناسب معلوم ہوتی ہے اور لڑکی میں جو خصوصیات میں چاہتا ہوں وہ سب آپ کی صاحبزادی میں موجود ہیں، اب مجھ کو امید ہے کہ آپ اس خاکسار کو اپنی غلامی میں لینے کا شرف عطا فرمائیں گے۔

جسوقت میر امجد علی کے پاس الطاف کا یہ خط پہنچا ہے وہ نہایت بے صبری کے ساتھ خط کا انتظار کر رہے تھے، خط پاتے ہی اُنھوں نے لفافہ کو عجیب وحشیانہ انداز سے چاک کیا اور خط پڑھ کر یہ معلوم ہوتا کہ ابھی خوشی کے مارے ان کا دم نکل جائے گا، تمام ہاتھ پیروں میں فرط مسرت سے ایک ارتعاش سا پیدا ہو گیا تھا اور خوشی کے مارے آنکھوں میں آنسو آ گئے بڑی دیر تک اپنے کو قابو میں لانے کی کوشش کے بعد میر صاحب خط لئے ہوئے گھر کے اندر گئے اور سیدانی کو بلا کر کہا۔

"لو مبارک ہو!"

سیدانی بھی خوشی سے اُچھل پڑیں اور خوشامدانہ انداز سے بولیں

"اللہ ہمیں پورا خط سُنا دو"

میر صاحب نے پورا خط خوشی کے مارے اٹک اٹک کر پڑھا اور پھر

داد طلب انداز میں سیدانی کی طرف چشمہ کے بیچ سے آنکھیں نکال کر دیکھنے لگے

سیدانی نے کہا "خدا کرے شادی کے بعد بھی لڑکا خوش رہے جس طرح اب ہے اور اللہ کرے ہماری رقن نصیبہ ور ثابت ہوں"۔

میر صاحب نے نہایت قرارت سے کہا "انشاء اللہ"۔

اور پھر کہنے لگے "تو اب بتاؤ کہ ان کو کیا لکھوں"؟

سیدانی نے کہا "اب لکھو گے کیا، بس اللہ کا نام لیکر لکھ دو کہ جب جی چاہے آؤ اور دو بول پڑھا کر لڑکی کو لیجاؤ، ہمارے پاس سوائے لڑکی اور اللہ کے نام کے کچھ نہیں ہے"۔

میر صاحب نے سیدانی کی اس رائے سے اختلاف کیا اور یہ طے کیا کہ تاریخ میں خود مقرر کر کے لکھوں گا، ان کو تو صرف ملازمت سے رخصت لینا ہے لیکن مجھ کو بہت کچھ انتظامات کرنا ہیں۔

اس کے بعد سیدانی سے پوچھا "تم بھی تو کچھ بتاؤ کہ کون سی تاریخیں مناسب ہوں گی"؟

سیدانی نے کچھ حساب لگایا پھر کہنے لگیں "رجب کی سولہ سترہ"۔

میر صاحب نے بھی ان تاریخوں پر غور کیا، اپنی ڈائری نکال کر انگریزی

تاریخیں دیکھیں اور پھر سر ہلا کر بولے "اوں ہونھ، میرے خیال میں بائیس تاریخ زیادہ موزوں رہے گی، جمعہ کا دن بھی ہے اور سرکاری دفتروں میں جمعہ اور ہفتہ کی تعطیل بھی ہے، میاں الطاف کو بھی آسانی ہو گی"۔

سیدانی کو بھی بھلا کیا اختلاف ہو سکتا تھا، لہٰذا میر صاحب نے تاریخ سے اطلاع دیدی۔

(۳)

اُناؤ کے اسٹیشن پر جس وقت گاڑی رُکی ہے میر امجد علی صاحب نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف دیکھنا شروع کر دیا کہ کہیں کوئی پھولوں میں لپٹا ہوا نوشہ نظر آئے کہیں زرق برق لباس میں ملبوس براتی دکھائی دیں مگر ان کی نگاہیں ناکام رہیں اور ان کو اختلاج سا ہونے لگا مجبوراً بیچارے اسٹیشن کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ذلیل کرنے لگے اور جب اس طرح بھی کوئی کامیابی نہ ہوئی تو پھاٹک پر آ کر کھڑے ہو گئے، اور ایک ایک مسافر کو دیکھنے لگے کہ ان میں سے دولھا اور اسکے ساتھی کون کون سے ہو سکتے ہیں، یہاں تک کہ ٹرین چھوٹ گئی اور اسٹیشن کے مسافر ایک ایک کر کے پلیٹ فارم سے باہر چلے گئے، اب میر امجد علی بالکل مایوس ہو چکے تھے

اور یہ طے کر لیا تھا کہ الطاف کی گاڑی یقیناً چھوٹ گئی ہے کہ اسی وقت ایک عجیب الخلقت "مخضب بزرگ" نے انکے قریب آ کر پوچھا "جناب کا اسم گرامی ؟"

میر صاحب نے ان کو سر سے پیر تک دیکھ کر کہا۔ "مجھ کو امجد علی کہتے ہیں، آپ کہاں سے آئے ہیں" ؟

اجنبی نے، جو اب میر صاحب کو پہچان چکا تھا، نہایت ادب سے کہا۔

"میں منڈارہ سے حاضر ہوا ہوں"

میر صاحب نے "اخاہ" کہہ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اور حیرت سے پوچھنے لگے۔ "نوشاہ کہاں ہیں ؟"

اجنبی نے کہا "میں ہی الطاف حسین"

میر صاحب نے بات کاٹ کر کہا۔ "آپ ہی الطاف میاں کے والد ہیں ؟"

اجنبی نے جھینپ کر کہا۔ "جی نہیں میں ہی الطاف حسین ہوں"۔

یہ سنتے ہی میر صاحب پر معلوم ہوا ہے کہ بجلی گری ہے یا فالج کا حملہ ہوا ہے اسوقت انکی صورت بہت کچھ سوالیہ نشان سے ملتی جلتی تھی اور وہ "؟" بنے ہوئے کھڑے تھے، ادھر الطاف کا یہ حال تھا کہ معلوم ہوتا تھا سیکڑوں جوتے پڑ گئے ہیں، اس کیفیت کو تھوڑی دیر بھی نہیں بلکہ دس پندرہ منٹ گزر گئے

اور دونوں پتھر کی مورت بنے کھڑے رہے خدا معلوم یکایک میر صاحب کے ذہن میں کیا آیا کہ وہ چونک کر کہنے لگے " تو تشریف لائیے نا "

اور اس کے بعد دونوں نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ بالکل خاموش گھر کی طرف روانہ ہو گئے، گھر پہنچ کر نوشہ کو تو مردانے مکان میں پہنچا دیا گیا اور میر صاحب منھ لٹکائے ہوئے زنانے مکان میں سیدانی کے پاس پہونچے۔

سیدانی بہت دیر سے بارات کا انتظار کر رہی تھیں میر صاحب کو دیکھتے ہی بولیں "۔ آگئی بارات "

میر صاحب نے مری ہوئی آواز سے کہا " ہاں آگئی " اور اس کے بعد سیدانی کو قریب بُلا کر کہنے لگے " تمام باتیں تقدیر سے ہوتی ہیں سمجھا تھا کیا، ہو گیا کیا، مجھ کو لڑکا سخت ناپسند ہے، اول تو عمر میں بالکل میرے برابر معلوم ہوتا ہے، دوسرے صورت ایسی ہے کہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی اگر چاہوں تو اس جھوٹے اشتہار پر مقدمہ چلا دوں مگر اب ہماری بے عزتی ہے، یہ وقت کچھ کہنے سننے کا نہیں ہے بس اب نہایت خاموشی کے ساتھ نکاح کر دینا ہی مناسب ہے ورنہ تمام عزت و آبرو پر پانی پھر جائیگا ہم تو بس یہی سمجھتے ہیں کہ رَوشن کی قسمت پھوٹ گئی "۔

سیدانی نے رونا شروع کر دیا مگر میر صاحب نے انکو ڈانٹ ڈپٹ کر چُپ کیا اور نکاح کے انتظامات میں اس طرح مصروف ہو گئے کہ گویا جنازہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

نکاح کے بعد سب سے زیادہ دلچسپ منظر وہ تھا جب آرسی مصحف کی رسم میں دولہا نے آئینہ میں دُلھن کا منھ دیکھا ہے، معلوم یہ ہوتا تھا کہ اپنا ہی چہرہ دیکھ رہے ہیں بس داڑھی مونچھ کی کمی ہے، الطاف نے بار بار آئینہ میں گھور کر دیکھا اور ہر مرتبہ اس کو اپنی ہی داڑھی مونچھ صاف تصویر نظر آئی، ارادہ کیا کہ بھاگے اُٹھ کر مگر پھر سوچا کہ یہ خدا نے اس فریب کا جواب دیا ہے جو جھوٹا اشتہار دینے میں خود ان کی طرف سے لڑکی والوں کو دیا گیا تھا۔

شادی کے بعد دُلھن کی دوسری خصوصیات بھی ظاہر ہو گئیں اور معلوم ہوا کہ بس اللہ نے ملائی جوڑی ایک اندھا ایک کوڑھی، الطاف اپنی بیوی سے متنفر تھے اور بیوی الطاف سے، البتہ اشتہار کا مضمون اب بھی اخبار کے صفحات پر تھا۔

ایک سنجیدہ بات

(اپریل فول نمبر رسالہ نیرنگ خیال لاہور کے لئے لکھا گیا۔)

واقعی میں ایک سنجیدہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں اس کا تعلق نہ مزاح لطیف سے ہے نہ ظرافتِ کثیف سے بلکہ یہ بات نہایت سنجیدہ نہایت ٹھوس اور نہایت کار آمد ہے، یہ اور بات ہے کہ آپ اس سنجیدہ بات کو بھی اسلئے مزاحیہ رنگ دیدیں کہ اس کا عرض کرنیوالا یہ خاکسار ہے لیکن اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر مزاحیہ مضامین لکھنے والے سے یہ حق ہمیشہ کے لئے چھین لیا جاتا ہے کہ وہ کبھی کوئی سنجیدہ اور غیر مزاحیہ بات ہی نہ کہے تو اس سے قبل کہ میں کوئی سنجیدہ بات کہوں اپنی مزاحیہ نگاری سے باحسرت و یاس مستعفی ہوتا ہوں، اسلئے کہ میں مزاحیہ نگاری کو عزیز رکھنے کے باوجود اسکے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں کہ میرا شمار ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مسخروں میں ہوجائے اور میں سوائے میرحیپت ہونے کے

دنیا کے اور کسی کام کا نہ رہوں۔

میں نے آج سے قبل بارہا یہ چاہا کہ جو سنجیدہ بات میں عرض کرنیوالا ہوں وہ عرض کر دوں لیکن ہر مرتبہ یہی سوچ کر چپ ہو رہا کہ میری یہ سنجیدہ بات بھی قہقہوں میں اڑا دیجائے گی، تبسّموں میں گم کر دی جائیگی اور اسکا شمار بھی اُن ہی باتوں میں ہوگا جن کا نتیجہ سوائے مہمل تبسّم، بے معنی خندہ اور لغو قہقہہ کے اور کچھ نہیں ہوتا اور میں چونکہ اپنی زیر بحث سنجیدہ بات کو اسقدر مضحکہ خیز بنانا نہیں چاہتا تھا لہذا چُپ ہو رہا لیکن آج جب کہ مجھکو اندیشہ ہے کہ اگر میں نے یہ سنجیدہ بات عرض نہ کر دی تو اسکی سنجیدگی مہملیت سے تبدیل ہو جائے گی، یہ بات عرض کئے دیتا ہوں اور پھر میں یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ اس کا تعلق نہ مزاح سے ہے نہ مسخرے پن سے بلکہ یہ ایک ٹھوس کارآمد اور سنجیدہ بات ہے۔

ہاں خوب یاد آیا کہ یہی سنجیدہ بات آج سے نہیں بلکہ برسوں سے مدّتوں سے اور ایک زمانہ سے میرے ذہن میں محفوظ ہے جب میں گھر پر مولوی صاحب سے بغدادی قاعدہ میں اَلف دو زبر اَن بے دو زبر بَن، تے دو زبر تَن پڑھتا تھا، اسوقت سب سے پہلے یہ سنجیدہ بات میرے ذہن میں

آئی تھی لیکن میں نے اس کو کسی سے نہیں کہا اسلئے کہ میری اس سنجیدہ بات کو میرا بچپن سمجھا جاتا، لوگ ہنس کر اُڑا دیتے یا زیادہ سے زیادہ مولوی صاحب اسکی داد ایک آدھ تھپڑ، ایک آدھ جھانپڑ، یا ایک آدھ لپوٹے کی صورت میں دیتے کہ "ابے تجھ کو ان باتوں سے کیا مطلب تو اپنا سبق یاد کر، الف دو زبر آن، بے دو زبر بَن، تے دو زبر تَن، تو جناب مجھکو کوئی کُتّے نے تو کاٹا نہیں تھا کہ میں اپنی سنجیدہ بات بھی ضائع کرتا اور مار بطور کمیشن کھاتا اسلئے میں چپ ہو رہا تا آنکہ میں کلام مجید ختم کرنے کے بعد مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی اُردو کتابیں اور کنگ پرائمر پڑھنے کے لئے ماسٹر صاحب کے پاس بٹھایا گیا، میں چاہتا تو اب نہایت آسانی کیساتھ اپنی یہ سنجیدہ بات عرض کر سکتا تھا مگر واللہ یہ میری انتہائی ناعاقبت اندیشی ہوتی اسلئے کہ آپ ہی غور کیجئے کہ اگر میں ان ماسٹر صاحب سے یہ سنجیدہ اور قیمتی بات کہتا تو وہ سوائے اسکے اور کیا جواب دے سکتے تھے کہ "سی اے ٹی۔ کیٹ۔ کیٹ معنی بلّی، آر۔ اے۔ ٹی۔ ریٹ۔ ریٹ معنی چوہا" اور مجھ کو بھی اپنی سنجیدہ بات چھوڑ کر مجبوراً یہی مہمل فقرے دُہرانا پڑتے، ورنہ آپ جانتے ہیں کہ ماسٹر صاحب کا لچکدار بید میرے جسم پر کیا کیا نقش و

نگار بنا دیتا۔ لہذا اس وقت بھی میں چپ ہو رہا اور اپنی اس قیمتی سنجیدہ بات کو نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے دماغ میں محفوظ رکھا۔

جب میں اسکول میں داخل ہوا تو میری عمر ایسی تھی کہ میں اپنے بُرے بھلے کی تمیز کر سکوں، دوسرے میرا داخلہ بھی اونچے درجہ میں ہوا تھا یعنی اب اگر میں وہ سنجیدہ بات کہہ دیتا تو ظاہر ہے کہ وہ بیکار نہ جاتی لیکن چونکہ آپ کو میری سنجیدہ بات کا اندازہ نہیں ہے اور آپ اس کے وزن کو محسوس نہیں کر سکتے لہذا آپ سطحی واقعات کو دیکھ کر یہ کہہ دیں گے کہ واقعی اس زمانہ میں یہ سنجیدہ بات بیکار نہ جاتی مگر واقعہ یہ ہے کہ اب بھی اس بات کے بیکار ہو جانے کا اندیشہ بجالہ موجود تھا، فرض کر لیجئے کہ میں یہ بات کہہ دیتا تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا کہ میرے کلاس ٹیچر صاحب اس کو بھی یا تو میری حماقت سمجھتے اور دانت پیس کر رہ جاتے، ورنہ میری شرارت سمجھ کر مجھکو بنچ پر کھڑا کر دیتے اور میں ایک کلمۂ حق کہہ کر منصور کی طرح سزاوار دار ہو جاتا، گویا بات بھی ضائع ہوئی اور سزا بھی ملی، خیر سزا ملنے کا تو افسوس نہ ہوتا لیکن میری وہ جان سے زیادہ عزیز بات ضائع ہو جاتی تو میں کیا کرتا۔ لہذا میں اسکول میں بھی مہر بلب رہا اور اسکول کے تمام ماسٹروں سے

لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب قبلہ تک کو میں نے اس کا اہل نہیں سمجھا کہ اپنی یہ قیمتی
سنجیدہ بات اُن سے کہدوں، واللہ اس سے تو اچھا یہ تھا کہ کسی بیل سے
کہہ دیتا، کسی بکری سے کہہ دیتا، کسی بھینس کے آگے بین بجا کر یہ بات سُنا
دیتا، بیل سُن کر سینگ مارنے دوڑتا، بکری سُنتی اور جُگالی کرتی رہتی۔
بھینس پاگُر کرتی رہتی مگر ہمارے یہ محترم اساتذہ تو اس قابل بھی نہ تھے
بتائیے کہ ہم اُن سے ایسی بات کہہ کر کیا کرتے؟

جب ہم اسکول سے انٹرنس پاس ہو کر نکلے اور کالج میں داخل کئے
گئے اُسوقت ہم کو اس قابل تسلیم کر لیا گیا تھا کہ ہم خاندانی مسائل پر غور کریں
اور اپنی قیمتی رائے دیں، یہ گویا ہمارے انسان ہونے کی پہلی سند تھی اور اب
ہم کو معلوم ہوا کہ گویا اب سے پہلے ہمارا شمار بھی حشرات الارض میں تھا، بہرحال
اب تو کوئی وجہ ہی نہ تھی کہ ہم اپنی وہ سنجیدہ بات نہ کہدیں جس کو اب تک
نہایت ناز و نعم سے ذہن میں پرورش کر کے اتنا بڑا کیا تھا، مگر آپ باور کیجئے
کہ اگر ہم اپنی تجربہ کاری کے فریب میں مبتلا ہو کر یہ ناتجربہ کارانہ حرکت کر بیٹھتے
تو ہماری یہ سنجیدہ بات بھی آج دنیا کی اُن باتوں میں ہوتی جن کے متعلق آج
تک فیصلہ نہ ہو سکا کہ آخر یہ باتیں کیوں کہی گئی تھیں۔ اس زمانہ میں ہماری

اس عظیم الشان بات کی صرف یہی وقعت ہو سکتی تھی کہ اہل خاندان یہ کہہ کر ناک بھوں چڑھا لیتے کہ صاحبزادے ہیں، ابھی دنیا کے نشیب و فراز کو کیا سمجھیں، پڑھنے لکھنے سے عقل نہیں آیا کرتی، یہ سب باتیں تو عمر سے تعلق رکھتی ہیں"۔ اور کالج کے پروفیسر صاحبان یہ کہہ کر "ہشت" کر دیتے کہ ٹانگ برابر کا چھوکرا جو ہمارا شاگرد بھی ہے اور نالائق بھی، ہم کو سبق پڑھانے چلا ہے، حالانکہ اس کو چاہیئے کہ ابھی خود زندگی بھر ہم سے پڑھے اور اس کے بعد بھی ہمارے مقابلہ میں جاہل اور کورا رہے، لیجیئے جناب دونوں طرف سے بیوقوفی کی سند اور حماقت کا ڈپلومہ مل گیا اور ہماری بات جو ضائع ہوئی اس کا کوئی ذکر ہی نہیں، انصاف سے بتائیے کہ کالج کی زندگی میں بھی اس قسم کی سنجیدہ بات جس قسم کی ہم عرض کرنیوالے ہیں کہدینا حماقت نہیں تو اور کیا ہوتی

ہم خدا کے فضل و کرم سے گریجویٹ بھی ہوئے اور ایل ایل بی بھی ہم نے نہ صرف پڑھنا لکھنا چھوڑا بلکہ باقاعدہ عملی اور ذاتی زندگی میں داخل ہو کر پریکٹس شروع کر دی، خود کماتے تھے اور اپنی گاڑھی کمائی کی روٹی کھاتے تھے، پیشہ ایسا کہ کسی کے باپ کے نوکر نہیں اور آمدنی ایسی کہ

خدانخواستہ کسی کے قرضدار یا محتاج نہیں ہماری قانونی قابلیت کی دھوم
مچی ہوئی تھی اور ہماری سمجھ کا ایک دنیا اعتراف کرتی تھی ہم پیشہ جماعت
عزت و احترام کرتی تھی، عدالتیں لوہا مان چکی تھیں، پبلک میں ہر دلعزیز
تھے اور موکل صاحبان گرانقدر فیسیں ادا کرنے میں کبھی پس و پیش نہ کرتے
تھے۔ اب بظاہر اس سنجیدہ بات کے عرض کرنے میں بھی کوئی امر مانع
نہ تھا، مگر نہیں جناب تھا اور ضرور تھا۔ ابھی میں عرض کرونگا اور سمجھاؤنگا
تو آپ کہیں گے کہ بیشک تھا اور میں نے بڑی عقلمندی سے کام لیا کہ
اپنی سنجیدہ بات نہ کہی۔

قصہ دراصل یہ تھا کہ اگر میں اپنی سنجیدہ بات کسی بحث کے دوران
میں عدالت سے کہتا تو عدالت فوراً خاموش کر دیتی ورنہ فریق ثانی کا وکیل
عدالت کی توجہ میری طرف مبذول کراتا کہ حضور اس بات کا تعلق چونکہ واقعات
مقدمہ سے نہیں ہے لہذا اس کو نہ لکھا جائے اور عدالت بھی اسکی رائے سے
متفق ہو کر میری اس قیمتی سنجیدہ بات کو خارج از بحث قرار دیدیتی، ایسی
صورت میں یہ ظاہر ہے کہ میری یہ مایہ صد ناز سنجیدہ بات کہیں کی بھی نہ رہتی
موکل سے کہنا اسلئے فضول تھا کہ وہ ان حقائق و معارف کو کیا سمجھے اس لئے

کہ مؤکل تو نام ہے اس اُلّو کا جو انسانی صورت میں پیدا ہو جائے اگر اس کو ایسی ہی سنجیدہ باتیں سمجھنے کی خدا نے قابلیّت دی ہوتی تو دنیا کو وکیلوں کی کیا ضرورت رہتی، اگر ہم یہ سنجیدہ بات اپنے ہم پیشہ حضرات سے عرض کرتے تو وہ فوراً ہی مطالبہ کرتے کہ دکھاؤ تعزیرات ہند کی کس دفعہ میں اس کا ذکر کیا گیا ہے اور چونکہ تعزیرات ہند میں واقعی یہ سنجیدہ بات نہیں ہے لہذا ان لوگوں سے بھی کہہ کر بات کا کھونا تھا، اسکے علاوہ اگر ہم کسی غیر متعلق شخص سے یہ بات کہہ دیتے تو اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ پبلک اسکی گہرائی تک پہونچنے سے قبل معلوم نہیں کس کس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی اور بات ضائع ہونے کے علاوہ یہ اندیشہ تھا کہ ہماری اس ہر دلعزیزی کو بھی صدمہ پہونچے گا جو خدا جانے کن کن طریقوں سے ہم نے حاصل کی ہے غالباً اب آپ بھی ہمارے ہمخیال ہو گئے ہوں گے کہ ہم نے یہ سنجیدہ بات نہ کہہ کر نہایت دور اندیشی سے کام لیا۔

اسی دوران میں ہم میونسپل کمشنر بھی ہو گئے اور اسکو ہماری ہر دلعزیزی کا زندہ معجزہ سمجھئے کہ بلا مقابلہ ہمارا انتخاب عمل میں آیا، حالانکہ کانگریسی جماعت کی طرف سے ایک چمار ہمارے مقابلہ میں کھڑا ہو رہا تھا مگر جب ہم نے اُس سے

آنکھیں چار کیں اور کہا کہ "بھائی بدھو! تم ہمارا مقابلہ کروگے" تو وہ شرافت مجسم چمار اپنے کان پکڑ کر بیٹھ گیا اور ہم گویا بلا خوف تردید "منتخب" ہوگئے، اس انتخاب میں زیادہ تر وہی لوگ منتخب ہوئے تھے جو آجکل مہاتما گاندھی کی آنکھوں کا تارا بنے ہوئے ہیں اور جن کی وجہ سے مالویہ جی کا "پوجیہ پادپن" خطرہ میں پڑا ہوا ہے، گویا بورڈ میں زیادہ تر وہی لوگ تھے جن کو نہایت آسانی سے بے تکی سے بے تکی بات سمجھائی جاسکتی تھی چہ جائیکہ وہ ہماری سنجیدہ بات جس کو ہم اپنا شاہکار سمجھتے ہیں بلکہ اگر ہم چاہتے تو کم سے کم تین سال تک کیلئے تو اپنی اس سنجیدہ بات کو بطور رزولیوشن منظور ہی کرالیتے اسکے بعد دیکھا جاتا مگر اس نادر موقع پر بھی ہم چپ بیٹھے آپ کہیں گے کہ انتہائی حماقت کی، مگر ہم آپ ہی سے یہ کہلوالیں گے کہ ہم نے انتہائی عقلمندی ہی سے کام لیا کہ وہ سنجیدہ بات نہ کہی، فرض کر لیجیے کہ ہم وہ بات کہتے اور اس پر بورڈ میں بحث ہوتی تو سب سے پہلے تو یہ اندیشہ تھا کہ شاید وہ جاہلوں سے بھرا ہوا بورڈ اس کو نہ سمجھ سکتا اور بفرض محال اسکو ممبران میونسپل بورڈ سمجھ بھی جاتے تو بھی سوائے اسکے اور کیا ہوتا کہ اسکو بطور رزولیوشن کے منظور کر لیا جاتا لیکن تین سال کے بعد جب میونسپلٹی دوسری مرتبہ جامہ بدل کر

ممبروں کی ولادت فرمائی اور ہم لوگ سابق "میونسپل کمشنر" ہو کر اپنے گھروں
میں آکر بیٹھتے تو کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ہماری وہی سنجیدہ بات قلم زد کردی جاتی؟
تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی اس سنجیدہ بات کو محض تین سال کے لئے
کہہ کر ہمیشہ کے لئے برباد کر دیتے، ہرگز نہیں، ہم تو اپنی اس بات کو اب تک
اس لئے دماغ میں محفوظ کئے ہوئے ہیں کہ اگر وہ دماغ سے نکلے تو ہمیشہ
محفوظ رہے تین سال کی عارضی بہار کے عوض ہمیشہ کی خزاں قبول کرنا
کون سی عقلمندی ہے؟

اس کو خدا کی شان سمجھئے کہ ہم کو لوگوں نے صوبجاتی مجلس قانون ساز
کی ممبری کیلئے کھڑا کر دیا اور حالانکہ مقابلہ نہایت سخت تھا یعنی اسطرف تو
ہماری جان ناتوان تھی اور اُدھر دو تین مسٹنڈے راجہ صاحبان اور ایک
کندۂ ناتراش ملک التجار صاحب بھی اسی نشست کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہے
تھے، گویا ایک بوٹی پر میں چار چیلیں منڈلا رہی تھیں بلکہ ایک آدھ گدھ بھی، خوب خوب
خوب اشتہار بازی ہوئی، خوب خوب مضمون بازیاں پمفلٹ بازیاں اور لکچر بازیاں ہوئیں
مگر آخر کار یہی ہوا کہ ع

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

ہو گئے صاحب ہم ایم، ایل، سی، بھی ہو گئے اور ہمارا شمار بھی اپنے
صوبہ کی قسمت بنانے یا بگاڑنے والوں میں ہو گیا اور صرف یہی نہیں بلکہ ایم،
ایل، سی، ہو کر تو گویا ہم کو عارضی طور پر سقہ شاہی مل گئی کہ بڑے بڑے انگریز
ہمارے مائی ڈیر ہو گئے اور لاٹ صاحب تک ہم سے مسکرا کر ہاتھ ملانے پر
مجبور ہوئے، صوبہ بھر کی تمام سرکاری اور غیر سرکاری تقریبوں میں شرکت کیلئے
مجبور ہونا پڑا، آج ان راجہ صاحب نے ایٹ ہوم دیا ہے تو کل اُن خان بہادر
صاحب نے گارڈن پارٹی، آج گورنمنٹ ہوس میں ڈنر ہے تو کل کسی آنریبل
منسٹر کی طرف سے لنچ، مختصر یہ کہ دن عید اور رات شب برات ہو گئی
پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر غیر محسوس طور پر کڑھائی میں، اخبارات میں ہماری
دھوم تھی تو بچہ بچہ کی زبان پر ہمارا نام تھا، آج لکھنؤ میں ہماری کار فرّاٹے
بھر رہی ہے تو کل نینی تال کے تال میں ہماری کشتی رواں ہے اور کونسل
چیمبر میں تو ہماری شان کچھ پوچھئے ہی نہیں گویا اب ہمارے جسم پر وہ
سر تھا جسمیں متفقہ اور مسلمہ طور پر بہترین قسم کا بھیجہ رکھا گیا ہو، ہمارے
عالی دماغ ہونے میں کسی کو کیا شبہ ہو سکتا تھا، اگر دن کو رات اور رات کو
دن کہتے تو بھی کسی عام گھاس انسان کی کیا مجال تھی کہ تردید کرتا۔ مگر کیا

آپ ان باتوں سے اور اس ٹیم ٹام سے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ہم کو اب
یقینی طور پر وہ بات کہدینی چاہیئے تھی اور اگر ہم نے اب بھی وہ بات نہ کہی
تو ہمالیہ کے برابر غلطی کی۔ ضرور کی، میں خطاوار ہوں اور ہمالیہ کے برابر
عظیم الشان قصور کا قصوروار ہوں، مگر پہلے سُن تو لیجئے کہ میں نے اس سُنہری موقع
سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھایا، آپ کو اپنی سادہ لوحی سے شاید اس بات کا یقین
ہے کہ ان صوبجاتی اور مرکزی مجالس قانون ساز میں نہایت سنجیدہ باتیں ہوتی
ہونگی اگر واقعی آپ کو اسکا یقین ہے تو آپ بیوقوفی کی حد تک نیک واقع ہوئے ہیں
میں چونکہ کونسل کا ممبر رہ چکا ہوں لہذا گھر کے بھیدی کی طرح آج یہ لنکا ڈھاتا
ہوں کہ ان مجالس قانون ساز میں سوائے اسکے اور کچھ نہیں ہوتا کہ بجائے سیدھے
طریقہ پر ناک پکڑنے کے مختلف طریقوں پر ناک پکڑنے کی کوششیں کیجائیں
ایک آنریبل ممبر گردن کی طرف سے ہاتھ گھما کر ناک پکڑتے ہیں تو دوسرے
ممبر بغل میں سے ہاتھ ڈال کر ناک پکڑنے کا کرتب دکھاتے ہیں، ایک
ایم، ایل، سی صاحب ٹانگوں کے بیچ سے ہاتھ نکال کر اور ہاتھ کو بغل
میں ڈال کر ناک پکڑنے کی فرمائش کرتے ہیں، مختصر یہ کہ اسی قسم کے کرتب
ہوا کرتے ہیں۔ وہاں اگر میں خدانخواستہ اپنی یہ سنجیدہ بات پیش کر دیتا

توآپ کو معلوم ہے کیا حشر ہوتا؟ اے جناب پہلے تو تحریک التوا پیش ہو جاتی پھر میری اس سنجیدہ بات پر نہایت غیر سنجیدہ قسم کی بحثیں ہوتیں اور آخر میں گھوم پھر کر ناک اس طرح ہاتھ میں آتی کہ میری یہ سنجیدہ بات ایک منتخب کمیٹی کے سپرد کر دی جاتی اور پھر اسی کے رحم و کرم پر رہتی، وہ کمیٹی خدا جانے اس سنجیدہ بات کے متعلق کون سی غیر سنجیدہ رپورٹ پیش کرتی اور اس کے بعد معلوم نہیں ایوان کا طرز عمل کس قدر غیر سنجیدہ ہوتا، تو جناب اگر مجھ کو اپنی سنجیدہ بات کی اس طرح درگت بنوانا ہوتی تو میں اس کو کونسل میں پیش کرتا اور گویا جان بوجھ کر پھینک دیتا لیکن میں نے یہ اندھاپن نہیں کیا اور اس آزمائشی موقع پر بھی اپنی اس سنجیدہ بات کی حقیقی اہمیت کو سمجھ کر اس کو دل ہی میں رکھا۔

میں آج کل نہ وکیل ہوں نہ میونسپل کمشنر اور نہ لیجسلیٹو کونسل کا ممبر ہوں بلکہ اس قسم کی پُرشور زندگی سے اپنے کو بچا کر میں نے وہ پُرسکون پیشہ اختیار کر لیا ہے جس کو صحافت کہتے ہیں یعنی میں ایک روزانہ اخبار کا اڈیٹر ہوں، خادم ملک و ملت، ترجمان قوم، پبلک کے مشترکہ ذہن کی واحد زبان یا یوں سمجھئے کہ خدائی فوجدار، بہرحال اب میں اس جگہ ہوں کہ میرے قلم کی

باریک نوک کے نیچے دنیا ناچ رہی ہے، میں سیاسیات کا ماہر ہوں،
ادبیات کا اُستاد ہوں، مذہبیات میں بھی کسی قبلہ و کعبہ سے پیچھے نہیں مختصر
یہ کہ میرا قلم اور اس کے ساتھ ساتھ خود میں دنیا کے تمام شعبوں پر خود مختار
حکمران کی حیثیت سے چھایا ہوا ہوں، حکومت میری نکتہ چینیوں سے نہیں
بچ سکتی، رعایا کو میری رہنمائی درکار ہے، لیڈرانِ قوم مجھ سے بے نیاز ہو کر
اپنی لیڈری کا کاروبار نہیں چلا سکتے، قابل سے قابل ادیب مجھ سے پرِ پرواز
مانگتے ہیں، میں ایک جنبشِ قلم بڑے سے بڑے عالی دماغ کے دماغ کا
بھرا ہوا بھُس منظرِ عام پر لے آتا ہوں اور میرے نوکِ قلم کے معمولی اشارے سے
کودن سے کودن انسان کا شمار مدبّروں میں ہو جاتا ہے۔ سچ بتائیے کہ
میں ایک قسم کی چھوٹی موٹی مع نعوذ باللہ خدائی کر رہا ہوں یا نہیں؟
اور اس وقت میرے لئے یہ کون سی مشکل بات ہے کہ اپنی اس سنجیدہ
بات کو کہہ دوں اور اس انداز سے کہہ دوں کہ گویا میرے اخبار کے مشرق
سے ایک ایسا آفتاب طلوع ہو جائے جو تمام دنیا کو جگمگا دے اور تمام
وہ لوگ جن کو خدا نے آنکھیں دی ہیں اس آفتاب کی روشنی کا اعتراف
کر لیں مگر نہیں ہیں اس اقتدار اور اس اختیار کے باوجود کم سے کم اپنی

اس سنجیدہ بات کے معاملہ میں اپنے کو ناچار اور مجبور پاتا ہوں، آپ
یقیناً مجھ کو اس وقت خالص گدھا سمجھ رہے ہوں گے اور آپ کو میرے
اُلّو ہونے میں قطعی شک نہ ہوگا مگر کیا کیا جائے، مجبوری ہے کہ میں آپ کی
اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے اپنے کو سچ مچ کا گدھا بنانے کیلئے
تیار نہیں ہوں اور بفرضِ محال میں نے گدھا بنجانا قبول بھی کرلیا۔ محض
آپ کی خاطر سے تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ میری وہ سنجیدہ
بات بھی تو تاریخی اہمیت کے ساتھ "ڈھینچوں" یا "سیپوں" بن کر رہ
جائے گی، ایسی حالت میں ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ مجھ کو
بیوقوف یا پاگل وغیرہ سمجھنے سے پہلے نہایت سنجیدگی کے ساتھ
اصل واقعہ کی نزاکت کو سمجھ لیجئے، اس کے بعد آپ کو اختیار ہے چاہے
مجھ کو پاگل سمجھئے یا اپنے کو۔ قصہ یہ ہے کہ اگر میں نے اپنی اڈیٹری
سے یہ فائدہ اٹھایا کہ اپنے اخبار میں اپنی وہ حاصل زندگی سنجیدہ بات
پیش کردی تو اس کا نتیجہ مختلف صورتوں میں رونما ہو سکتا ہے شلاً اخبار
قانون مطابع کے ماتحت مع چھاپہ خانہ، اڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر جیل خانہ
بھیجدیا جائے، یا اخبار کو بحق ملک معظم ضبط کرلیا جائے اور اس خاکسار کو

رام بانس کوٹنے کی خدمات پر معمور کردیا جائے یا کم سے کم یہی ہوسکتا ہے

کہ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر ایک خفیہ مراسلہ بھیجدیں کہ اگلی مرتبہ تو خیر اس

قسم کی سنجیدہ بات چھاپ دی گئی مگر اب ہمیشہ کے لئے توبہ کرو، ورنہ

زرِضمانت مع تمہارے ضبط کرلیا جائے گا، یا خود اس خاکسار کو اپنے بنگلہ پر

بُلوا کر تنہا کمرے میں پوچھیں کہ کیوں حضرت یہ کیا؟ تو ان تمام صور توں

میں صرف یہی ہوگا کہ بات بھی کھوئی اور خود بھی بس یوں ہی سے رہ

گئے تو جناب ہم کو بخشیے، ہم اپنی اس سنجیدہ بات کو اس طرح مع اپنے

کے برباد کرنا نہیں چاہتے۔

لیکن سوال تو یہ ہے کہ وہ سنجیدہ بات کیوں کر اور کس طرح کہی

جائے۔ عمر کا آخری حصّہ ہے اگر خدانخواستہ ملک الموت صاحب بغیر

اطلاع کے تشریف لے آئے تو یہ بات ہمارے ساتھ ہی قبر میں چلی جائیگی

اولاد اس قابل نہیں کہ اس کو علم سینہ کا اہل سمجھا جائے، لہٰذا اب ہم اس

نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ اڈیٹر صاحب رسالہ "نیرنگ خیال" کو اپنی یہ تمام

عمر کی کمائی سپرد کردیں اور ان کے ذریعہ یہ بات ناظرین نیرنگ خیال

تک پہونچ جائے اس طرح ہماری بچت کی صورت یہ ہے کہ اگر قانون

مطابع کی گرفت ہوگی تو اڈیٹر صاحب نیرنگ خیال کے لئے نہ
کہ ہمارے لئے، اس لئے کہ ہم تو انکار ہی کر دیں گے کہ اس سے ہمارا
کوئی تعلق ہی نہیں، اور اگر یہ بات واقعی مؤثر ثابت ہوئی تو ہمارا نام ہمیشہ
زندہ رہے گا، مگر اس سے قبل کہ اپنی اس سنجیدہ بات کو عرض کریں، ہم
آپ کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اسکا کوئی تعلق ہماری مزاحیہ نگاری سے
نہیں ہے اور ہم آپ سے یہ بھی عہد لیتے ہیں کہ واقعی آپ انتہائی
سنجیدگی سے اس پُر سنجیدہ بات پر غور کیجئے گا، آپ نہا دھو کر، پاک
صاف ہو کر، بخلوص تمام اس سنجیدہ بات کو دیکھئے اور پھر اس سنجیدگی
سے غور کیجئے وہ بات یعنی وہی سنجیدہ بات جس کو اب بھی بیان کرتے
ہوئے ڈر رہے ہیں۔ ایک نہایت لطیف نقاب کے ساتھ درج
ذیل ہے، الفاظ کو اُلٹ کر وہ نقاب ہٹائیے اور اس سنجیدہ بات کے
دیدار سے مشرف ہو جئے۔ وہ بات یہ ہے :۔

"لُوف لیرپا"۔

برادرِ عزیز مرحوم

ہم اپنا نام سُن کر چونک پڑے ـــــ والدہ صاحبہ اپنی بہو سے فرما رہی تھیں "اے دُلھن میں کیا بتاؤں بس یہ سمجھو کہ چاند میں میل ہے اور اُس میں میل بھی نہ تھا، سُرخ و سفید رنگ، موٹا تازہ، سیب کے ایسے گال، پتلے پتلے لب، چوڑی پیشانی، تمھارے میاں تو اس کے سامنے بالکل غلطا معلوم ہوتا تھا۔"

لفظ غلطے پر ہم مخاطب صحیح بن کر اسی طرف متوجہ ہو گئے اور وہاں ایک قہقہہ بلند ہوا۔ ہم نے تعجب سے پوچھا:۔

"کس کا ذکر ہے؟"

والدہ نے سنجیدگی سے کہا "احمد کے متعلق کہہ رہی ہوں کہ ایسا خوبصورت بچہ میں نے تو کبھی آنکھوں سے دیکھا نہیں اور مجھ ہی پر کیا منحصر ہے اس کو تو جو کوئی دیکھتا تھا بس دیکھتا رہ جاتا تھا چھ مہینہ کا بچہ اور معلوم ہوتا تھا کہ سال ڈیڑھ سال کا ہے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں میں غلمٹے کے متعلق پوچھتا ہوں"۔

والدہ صاحبہ نے منھ در منھ نہایت صفائی سے کہا:۔

"ہاں بھیّا یہ کوئی جھوٹ ہے سچ مچ تم اس کے سامنے بالکل غلمٹے معلوم ہوتے تھے وہ تو بالکل شہزادہ تھا شہزادہ"۔

وہاں پھر قہقہہ بلند ہوا اور ہم اپنا سا منھ لیکر رہ گئے اور تو اور اس وقت ہم کو اپنی بیگم صاحبہ کی نظروں میں حقارت نظر آرہی تھی جو ہم کو ع

ترا دیدی و یوسف را شنیدی

کے مغالطہ میں مبتلا کئے ہوئے تھیں، سچ پوچھئے تو ہم اسوقت اور بھی پانی پانی ہوئے جارہے تھے، اس لئے کہ صرف والدہ صاحبہ کہتیں اور بیگم صاحبہ سُنتیں تو چنداں مضائقہ نہ تھا مگر وہاں تو کچھ ہمارے سسرالی اعزا بھی تھے اور کچھ بیگم صاحبہ کی سہیلیاں، ایک طرف مہترانی بھی بیٹھی ہوئی تھی اور والدہ صاحبہ کی ملازمات کے علاوہ خود ہماری ملازمہ بھی موجود، بتائیے کہ ان سب نے ہمارے متعلق کیا رائے قائم کی ہوگی؟

قصہ اصل میں یہ ہے کہ ہم صورت و شکل میں اگر بُرے نہیں تو اچھے بھی نہیں ہیں، ہاں اگر صورت کی اچھائی اسی کا نام ہے کہ انسان کانا نہ ہو

نکٹا نہ ہو، اس کا منھ لقوہ زدہ نہ ہو، اس کے چہرہ پر گومڑے نہ ہوں، اسکی ناک کے نیچے منھ اور ادھر اُدھر دو کان لگے ہوں تو اس اعتبار سے ہمارا شمار بھی حسینوں میں ہو سکتا ہے ورنہ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ نہ تو ہمارا رنگ سُرخ سفید ہے، نہ سیب ایسے گال ہیں، نہ فسوں ساز آنکھیں ہیں، نہ قاتل ابرو اور نہ کوئی ایسی خصوصیت جو ہم کو قتّال جہاں بنا سکے لیکن باوجود اس کے یہ کچھ قدرتی بات ہے کہ اگر کوئی ہم کو دیکھ کر منھ بنائے یا ہم کو بدصورت مشہور کر دیا جائے یا کسی سے بلاوجہ تقابل کر کے ہم کو ذلیل کیا جائے تو بُرا ضرور معلوم ہوگا خصوصیت کیساتھ ایسی حالت میں جب کہ ہم کو حسین سمجھنے والی بھی چند ہستیاں موجود ہوں، بہر حال یہ واقعہ ہے کہ اسوقت ہم خفیف بھی ہو رہے تھے اور چور کی داڑھی میں تنکا کی مثال بھی ہم پر صادق آ رہی تھی۔ ہم نے اپنی خفّت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بات صرف یہ ہے کہ دنیا مردہ پرست ہے، اگر ہم آج زندہ نہ ہوتے اور بجائے احمد کے بچپن ہی میں فوت ہو گئے ہوتے تو آج اسی قسم کا قصیدہ ہماری شان میں پڑھا جاتا۔"

والدہ صاحبہ نے فوراً ترکی بہ ترکی فرمایا "خدا نہ کرے کہ تم اُنکی جگہ پر یہ نہیں وہ ہو گئے ہوتے مگر ہاں بھیّا یہ تو میں ضرور کہوں گی کہ میرے اور بچے بھی تو مرے ہیں لیکن میں سوائے احمد کے کسی کی خوبصورتی کا ذکر نہیں کرتی، وہ تو بالکل چاند کا ٹکڑا معلوم ہوتا تھا اور تم واقعی اُس کے بھائی نہیں معلوم ہوتے تھے۔

ممانی صاحبہ نے ابکائی لینے کے انداز میں کہا "تم تو بھیّا خدا کی پناہ بچپن میں کچھ ایسے گھناؤنے تھے کہ بس توبہ ہے"۔

وہاں پھر ایک قہقہہ پڑا اور ہم پھر سے پسینہ میں ڈوب گئے ہم نے فریادی کی حیثیت سے بیگم کی طرف جو دیکھا تو اُنکی نظروں سے یہی معلوم ہو رہا تھا کہ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی ہیں:۔

"ہا ـــــ گھناؤنے"۔

اور ہم نے رونے کے انداز سے زبردستی کی ہنسی ہنستے ہوئے گردن جھکالی۔

اصل قصہ یہ ہے کہ جن حضرت کے حُسن کی تعریف میں یہ پُل باندھے جارہے تھے اور جن کے مقابلہ میں ہم کو ڈوب مرنے پر مجبور کیا جارہا تھا وہ ہمارے

حقیقی برادر عزیز تھے اور ہم سے کوئی دو سال چھوٹے، لوگ کہتے ہیں
کہ وہ حسین تر تھے اور ہم گویا کریہہ المنظر، لیکن یہ روایات ہمارے خیال
میں پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں اور قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ واقعہ صرف
یہ ہوگا کہ بس انیس[۱۹] بیس[۲۰] کا فرق ہوگا، وہ اتفاق سے بیس ہو گئے ہونگے
لیکن چونکہ وہ خوش قسمتی سے مر گئے لہذا ان کو اب اچھالا جارہا ہے اور چونکہ ہم
بے غیرتی سے زندہ ہیں لہذا گھر کی مرغی دال برابر بنے ہوئے ہیں ع

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

والدہ صاحبہ نے آب دیدہ ہو کر کہا:۔

"اگر آج وہ زندہ ہوتا تو کیا خوشرو جوان ہوتا اور تمہارے برابر کا
معلوم ہوتا"

ہم نے اپنے دل میں کہا اچھا ہوا وہ حضرت مر گئے ورنہ آج ہمارے
لئے ہر دم تازہ مصیبت ہوتے لیکن والدہ صاحبہ سے یہی کہا:۔

"خیر اب اس بدصورت ہی کو دیکھ کر صبر کیجئے"

والدہ صاحبہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ مہترانی صاحبہ نے اور
بلی ہم پر جھاڑو پھیر دی۔

"ہمارے کلّوہی اچھے خدا ان کو سلامت رکھے، یہ کلوٹے ہی سب کچھ ہیں"
بس یہ سمجھئے کہ ہم گویا مر ہی تو گئے اور ادھر لڑکیوں سے لے کر
بوڑھیاں تک سب ہنسی کے مارے لوٹی جاتی تھیں یہاں تک کہ بیگم
صاحبہ بھی اپنے سرتاج کو مہترانی کے منھ سے کلوا کہلوانے کے بعد باغ
باغ تھیں، والدہ صاحبہ نے مہترانی کو گویا داد دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں خدا کرے میرا کلّو ہی جیتا رہے اور اپنے ہاتھ سے مجھ کو
قبر تک پہونچائے، اب تو میرے لئے سب کچھ یہی ہیں، خوبصورت
ہیں تو اور بدصورت ہیں تو"۔

ہم نے جل کر کہا "مجبوری کا نام صبر ہے"۔

ہماری سالی صاحبہ بولیں "دولھا بھائی کچھ ایسے زیادہ کالے
تو نہیں ہیں"۔

ممانی صاحبہ نے منھ بنا کر کہا "اُس کے مقابلے میں تو یہ کالے
کوئلہ ہیں"۔

بہن صاحبہ نے فرمایا "رنگ تو خیر نہیں مگر نقشہ انکا بھی برا نہیں ہے"
ممانی صاحبہ نے آنکھیں نکال کر کہا "نہ اس کے نقشہ سے ان کا

کوئی مقابلہ وہ تو کوئی چیز تھا، زندہ ہوتا تو آج بھی یہ اس کے غلام معلوم ہوتے"۔

سب کھلکھلا کر ہنس دئے اور ہم نے دل ہی دل میں سچے دل سے خدا کا شکر ادا کیا کہ اگر اس نے ہم کو زندہ رکھا تو ہمارے فریق کو اٹھا لیا، ورنہ وہ آج زندہ رہتا تو ہم کو حرام موت مرنا پڑتا اور حرام موت مرنے سے قبل خدا جانے کن مصیبتوں کا سامنا ہوتا، آج تو خیر صرف اسکے تصور سے سب نے رقابت پیدا کرا دی ہے لیکن اگر وہ حضرت کہیں بقید حیات ہوتے تو ہر وقت کا تقابل ہم کو زندہ در گور بنا دیتا۔ ہم کو محسوس ہو رہا تھا کہ محض اس ذکر سے ہم تمام لوگوں کی نظر سے گر گئے ہیں اور سب ہم کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں بلکہ ہم خود اپنی نظروں میں کچھ ذلیل ہو رہے ہیں اور اگر کہیں وہ زندہ ہوتا تو بتائیے ہمارے لئے سوائے مرنے کے کیا چارہ تھا؟ اس بے موقع ذکر سے ہم کو اسلئے اور بھی تکلیف ہو رہی تھی کہ اب ہماری بیوی جو اب تک ہمارے حُسن کو مردانہ حُسن کا ایک معیار سمجھتی تھیں ہمارے لئے کیا رائے قائم کریں گی تمام دنیا تو بیویوں کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کو خواہ وہ کیسا ہی

کیوں نہ حسین سمجھیں لیکن ہمارے یہاں ہماری بیوی کو ہم سے متنفر بنایا جا رہا تھا۔ سسرال والے بھی ویسے چاہے زبان سے کچھ نہ کہیں مگر دل میں کیا کہتے ہوں گے کہ کہاں قسمت پھوٹی ہے تو کم سنیاں ادب کی وجہ سے خاموش تھیں لیکن ہم کو معلوم تھا کہ ان کے دل میں بھی ہماری عزت شاید ہی کچھ رہی ہو۔ ہم کسی اور کو کیوں کہیں جب خود ہم چور ہو رہے تھے اور اسوقت تو یقیناً شرمندگی اور کھسیانے پن نے ہمارے حُسن میں چار چاند لگا دیے ہوں گے۔ ہم اس بحث کو کسی طرح ٹالنا چاہتے تھے لیکن سب کو شاید اسی میں لطف آرہا تھا چنانچہ بیگم صاحبہ نے فرمایا:۔

"تو اب آپ کیوں بُرا مانتے ہیں؟"

ہم پر گویا اور بھی جوتے پڑ گئے لیکن ہم نے جلدی سے کہا:۔

"بُرا ماننے کی کون سی بات ہے۔ میں بھی آپ سے ایسا ہی کہوں گی"

اب گویا آپ بھی بنا رہی ہیں"۔

والدہ صاحبہ نے فرمایا:۔

"پہلے سے تو تم اب بہت غنیمت ہو گئے ہو"۔

ہم نے ذرا خوش ہو کر ایک قانونی نکتہ نکالا۔ "میں بدصورت تھا مگر اب ذرا غنیمت ہو گیا ہوں وہ خوبصورت تھا تو اب ذرا بدصورت ہو گیا ہوتا اور اس طرح ہم اور وہ دونوں تقریباً یکساں ہو گئے ہوتے"۔

ممانی صاحبہ نے پھر حقارت آمیز تیور سے کہا "نہ کہیں وہ لاکھ بُرا ہوتا مگر بھیا تمہارا جیسا چمرخ تو کبھی بھی نہ ہوتا"۔

چمرخ کی پھبتی گویا چھا گئی، ہم واقعی چمرخ بن کر رہ گئے اور سب ہنسی کے مارے قلابازیاں کھانے لگے۔

والدہ صاحبہ نے ان کی تائید کرتے ہوئے کہا:۔

"ہاں واقعی وہ ان کا ایسا تو نہ ہوتا، اس کی ہڈی چوڑی تھی اور انداز تھا موٹے تازے ہونے کا، یہ تو ہمیشہ کے مریل ہیں"۔

اب مریل پر سب کو ہنسی کا دورہ اُٹھا اور ہم ان متواتر حملوں سے بالکل پسپا ہو کر رہ گئے، یہاں تک کہ ہم کو اب غصہ آنے لگا چنانچہ ہم نے بُرا مان کر کہا:۔

"تو پھر اس چمرخ اور مریل کا تم سب نے گلا پہلے ہی کیوں نہ گھونٹ

دیا اور اُن پری پیکر کو کیوں مرنے دیا۔"

ہمارے اس غصہ پر اور بھی تفریح ہوئی اور سب کی تفریح پر ہم کو اور بھی غصہ آیا، چنانچہ ہمشیرہ محترمہ نے نمک مرچ چھڑکتے ہوئے کہا۔ "بُرا کیوں مانتے ہو کیا چرخ نہیں ہو، ذرا آئینہ تو دیکھو۔"

ہم نے سنجیدگی سے بُرا مان کر کہا:۔

"تو پھر میں اپنی صورت کو کیا کروں جس کو میری صورت دیکھ کر تکلیف ہوتی ہو وہ نہ دیکھے مجھ کو، یہ اعتراض تو مجھ پر نہیں ہے صورت بنانے والے پر ہے۔"

ہماری اس ناگواری کی شاید کسی کو توقع بھی نہ تھی لیکن جب سب نے یہ رنگ دیکھا تو چپ ہو گئے، البتہ والدہ صاحبہ نے اُٹھ کر چٹ چٹ ہماری بلائیں لیتے ہوئے کہا:۔

"واہ کون کہتا ہے کہ میرا بچہ بدصورت ہے، ہزار دو ہزار میں اب بھی ایک ہے۔"

مگر ہمشیرہ محترمہ نے چلتے چلاتے آخری چرکہ دیا کہ "سچ ہے خدا غلام پیدا کرے مگر غلام کی صورت نہ پیدا کرے۔"

ہم ناچ کر رہ گئے لیکن والدہ صاحبہ نے جھڑک کر کہا "چل دور

تو اس کو ہمیشہ یوں ہی ستاتی ہے پہلے اپنی صورت تو دیکھ"۔

خیر اس وقت تو یہ بحث یہیں پر ختم ہو گیا لیکن اب گویا ہمارے

مرحوم برادر عزیز کا حُسن ہماری چڑھ بن گیا ہے کہ جہاں ہم کو کسی نے

ذرا خوش دیکھا بس وہی تکلیف دہ تذکرہ شروع ہو جاتا ہے جہاں ہم نے

کسی سے مذاق کیا بس اس کا جواب ہم کو یہی ملتا ہے کہ لیجئے چرخ

بھی بولے، بڑے اور برابر والے تو خیر کھری کھری سناتے ہیں لیکن

اپنے سے چھوٹوں کا بھی یہ حال ہے کہ گھما پھرا کر اور تہذیب کے

دائرے میں لا کر ہم پر چوٹیں ہوتی رہتی ہیں اور ہم ہمیشہ یہی سوچتے

ہیں کہ واقعی اگر وہ حضرت نہ مرے ہوتے تو آج ہم پر کیا قیامت

گزر رہی ہوتی جب کہ مرنے کے بعد بھی وہ اس طرح ہماری دُکھتی

ہوئی رگ بنے ہوئے ہیں۔

(نوٹ بلکہ تاکید) اس مضمون کو پڑھ کر لوگوں کو یہ گمان ہو سکتا

ہے کہ شوکت تھانوی صورتاً خدا جانے کیا ہوں گے لیکن ہم اس

موقع پر یہ بتا دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اول تو اس مضمون کا ہیرو آپ شوکت تھانوی کو نہ سمجھیں اور اگر سمجھیں بھی تو ہم کو اعتراف ہے کہ یہ مضمون واقعات سے کسی قدر مختلف ہے اور "زیب داستان کے لئے" اس خاکسار نے اپنے کو ایسا بدزیب بنایا ہے ورنہ خدانخواستہ اسقدر مکروہ صورت نہیں ہے۔

(شوکت تھانوی)

چوری

اگر گاندھی جی اپنی سوانح عمری میں اپنی زندگی کے تاریک پہلو دکھا کر سُرخرو ہو سکتے ہیں تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے بھی چوری کی ہے۔

ہم کو جیب خرچ وہی ملتا تھا جو اوسط درجہ کی حیثیت کے شرفا اپنے بچوں کو دے سکتے ہیں لیکن اخراجات ہمیشہ رئیسانہ رہے ہیں چنانچہ ہمارے لئے یہ ناممکن تھا کہ اسکول میں درمیانی چھٹی کے وقت ہم تنہا پھل کھائیں اور ہمارے دوست منہ دیکھیں یا ہم دو چار آنے پیسوں کے لئے اپنے غمگسار ہم جماعتوں کی فرمائشیں رد کریں یہی وجہ تھی کہ ہم کو پہلے تو ہر روز کسی نہ کسی قیمتی کتاب کسی نہ کسی جدید کاپی اور کچھ نہیں تو کسی مفروضہ اسکولی چندہ کے لئے گھر سے اسکول چلتے وقت دام لینا پڑتے تھے اور وہ رقم اسکول کی درمیانی چھٹی میں میوہ فروش کی جیب میں پہونچکر گویا ہمارے اور ہمارے مخصوص

احباب کے پیٹ میں پہونچ جاتی تھی، غالباً یہی وجہ تھی کہ ہم اپنے
دوستوں کی آنکھوں کا تارہ تھے اور ہمارے دوست ہر وقت اسکے
لئے تیار رہتے تھے کہ جہاں ہمارا پسینہ گرے وہاں اپنا خون بہادیں،
ہم تو سچ کہتے ہیں کہ ایسے دوستوں کو اگر کلیجہ بھی نکال کر کھلادیا جائے
تو کم ہے۔ ہم کیا تعریف کریں اپنے ان دوستوں کی اسقدر ہم سے محبت کرتے تھے
کہ حقیقی بھائی بھی نہیں کرسکتے اور پھر ہم سے ایسے بے تکلف کہ گویا سچ مچ
کے سگے بھائی۔ اگر ہم خود کھلانے سے انکار بھی کریں تو وہ لڑ لڑ کر ہم سے
کھالیتے تھے، یہ بے تکلفی کبھی غیر دل میں ہوتی ہے لیکن بعض اوقات ہم بھی
مجبور ہوجاتے تھے اس لئے کہ ہر روز ایک نئی اسکول کی ضرورت سے دام
حاصل کرنا بھی کوئی آسان کام نہ تھا، رات بھر غور کرتے تھے تب کہیں جا کر صبح کو
کوئی ترکیب ذہن میں آتی تھی لیکن ہر روز تو یہ چالیں چل نہیں سکتے تھے
مجبوراً ہم کو میوہ فروش کے یہاں اپنا حساب کھولنا پڑا اور نہایت بےفکری
کے ساتھ قرض پر احباب نوازی ہونے لگی۔

پہلے مہینہ میں تو میوہ فروش کا مطالبہ اس طرح ادا کیا کہ اسکول کی
ڈیڑھ روپیہ فیس کے علاوہ ڈھائی روپیہ جرمانہ بھی گھر سے لیگئے تھے

لیکن دوسرے مہینہ پورے چار روپیہ کا مطالبہ تھا بہر حال کسی نہ کسی
طرح دو روپیہ ادا کردئے اور دو روپیہ باقی رکھ کر پھر اس لین دین کو چالو
رکھا لیکن ابکی مہینہ کی آخری تاریخوں میں جب میوہ فروش نے سات روپیہ
دو آنہ کی سنائی تو ہوش اُڑ گئے لیکن ہمارے ایک جاں نثار دوست نے
کیلے کی پھلی منہ میں رکھتے ہوئے کہا :-

"سات روپے دو آنے ہی تو ہوئے دیدیے جائیں گے"۔

میوہ فروش نے بھی مطمئن ہو کر کہا :-

"ہاں یہ تو معلوم ہے کہ مل جائیں گے، ہمارے بھیا کوئی بھاگ تھوڑی
جائیں گے مگر ابکی ہم سب لیں گے"۔

ہمارے دوسرے غمگسار مونگ پھلی کی ٹنگار کرتے ہوئے بولے :-

"ہاں ہاں سب لے لینا، ایک پیسہ کے امرود لاؤ، اب ہوئے
سات روپیہ سوا دو آنے"۔

لیکن ہمارا خون خشک ہوا جاتا تھا اور طبیعت گھبرا رہی تھی ہم کو
اسی وقت سے فکر تھی کہ کس طرح اس بار سے سُبک دوش ہوں گے
اسوقت سے برابر اسی فکر میں رہنے لگے کہ اب والد صاحب قبلہ کو کون سا

چمکہ دیں، بہ مشکل تمام یہ ترکیب ذہن میں آئی کہ سائنس کے کسی آلہ کے ٹوٹ جانے کا افسوسناک واقعہ نہایت انفعال کے ساتھ سنا کر اسکی قیمت حاصل کریں، اس ترکیب کے ذہن میں آتے ہی ہم ایک دم سے اچھل پڑے اور نہایت مسکین صورت بنائے ہوئے والد صاحب قبلہ کے پاس پہونچے انھوں نے صورت سوال دیکھ کر خود ہی پوچھا:۔

"کہئے جناب کون سی خدمت میرے لائق ہے"؟

ہم نے ذرا رونی صورت بنا کر ایک ہاتھ کی انگلیوں سے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا:۔

"کل ہم اسکول میں ——— کل ہم سائنس کے کمرے میں ——— کل ہم اسکول کے سائنس کے کمرے میں پانی کا درجۂ حرارت دیکھ رہے تھے"۔

والد صاحب نے گھبرا کر کہا۔ "تو کیا ہوا"؟

ہم نے اور بھی بھولے پن سے کہا:۔

"ہم پانی کا درجۂ حرارت دیکھ رہے تھے کہ چھینک آ گئی"

والد صاحب نے کہا۔ "شکر الحمد للہ، اچھا پھر"

ہم نے بسورتے ہوئے کہا۔ "ہم پانی کا درجۂ حرارت دیکھ رہے تھے

کہ ہم کو چھینک آگئی اور وہ ——— وہ ——— تھرمامیٹر ———"

والد صاحب نے جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔ "ٹوٹ گیا ——— پھر

میں کیا کروں؟ ———"

ہم نے اور بلکہ بسورتے ہوئے کہا:۔

"ماسٹر صاحب کہتے ہیں کہ ———"

والد صاحب نے غصّہ سے کہا۔ "کیا کہتے ہیں۔ ماسٹر صاحب"؟

ہم نے سہم کر کہا:۔

"کہتے ہیں کہ اس کی قیمت لاؤ نہیں تو اسکول سے نام کاٹ دینگے"۔

والد صاحب نے گرجتے ہوئے کہا:۔

کاٹ دیں نام اب ہم تم کو پڑھوانا ہی نہیں چاہتے، کاٹ دیں

نام، کہہ دینا اُن سے کہ کاٹ دیں نام"۔

ہم نے جلدی سے کہا۔ "اور کہتے ہیں کہ قیمت تو دینا ہی پڑے گی"۔

والد صاحب کو سخت غصّہ آگیا۔

"کیسے قیمت دینا پڑے گی، دیکھیں تو اب کیسے لے لیتے ہیں۔ ہم تو

نہیں دیں گے اور قیمت کیا ہے اس تھرمامیٹر کی"؟

ہم نے گڑبڑا کر بجائے سات روپے سوا دو آنے کے کہہ دیا۔ "پانچ روپیہ"
والد صاحب کو کیا معلوم تھا کہ ہم نے دو روپے سوا دو آنے کی
رعایت کی ہے، وہ پانچ ہی کا نام سُن کر بولے :۔
"پانچ روپے کا تھرما میٹر؟ کیا ہیرے کا تھا؟"
ہم نے کہا۔ "جی نہیں ـــــ ہیرے کا نہیں تھا مگر قیمتی تھا۔"
کہنے لگے۔ "اچھا تو جاؤ اُن سے کہہ دو کہ نام کاٹ دیں ہم پانچ روپیہ
قیامت تک نہ دیں گے، جاؤ یہاں سے"۔
ہم ادھر منھ لٹکائے ہوئے وہاں سے چلے اُدھر والدہ صاحبہ
مدظلہا نے چپکے سے والد صاحب کے کان میں کہا، ہم کو یہ نہیں معلوم کہ
کیا کہا تھا، البتہ یہ معلوم ہے کہ والد صاحب اُن پر برس پڑے کہ :۔
"ہاں تم ہی تو ان لڑکوں کو خراب کرتی ہو، اب بتاؤ کہ میں کہاں سے
ان لوگوں کے لئے چوری کروں"؟
والدہ صاحبہ ان سے تو پھر کچھ نہ بولیں لیکن چلتے وقت پانچ روپے کا
ایک نوٹ چپکے سے ہم کو دیدیا اور ہم اس کو رشوت کی طرح چپکے سے
لیکر چلتے ہوئے۔

پانچ کا تو خیر انتظام ہو گیا لیکن اب سوال یہ تھا کہ باقی دو روپے سوا دو آنے کہاں سے آئیں اسلئے کہ پانچ روپے والے چرکے کے بعد اب یہ ناممکن تھا کہ دو روپے سوا دو آنے والی چوٹ بھی ساتھ ہی ساتھ دیجائے اور اب کی مرتبہ میوہ فروش کا تمام حساب صاف نہیں کرتے ہیں تو وہ گھر پر آکر الگ بھانڈا پھوڑے گا اور ہیڈ ماسٹر صاحب تک الگ یہ قصہ پہونچے گا، آخر بہت غور و فکر کے بعد اس معمہ کا ایک حل ذہن میں آہی گیا اور ہم نے بھی اس عالم نزع میں حرام کو حلال قرار دے کر یہ طے کر لیا کہ کچھ بھی ہو بہر حال دو روپے سوا دو آنے تو ضرور ہی حاصل کئے جائیں گے۔

رات کی خواب آور ہوائیں والد صاحب قبلہ کو تھپک تھپک کر سُلا رہی تھیں اور وہ خرّاٹے لے لے کر رات کے سکون کو مکمل نہ ہونے دیتے تھے، والدہ صاحبہ مدظلہا بھی بے خبر سو رہی تھیں، لیکن ان دونوں کا یہ ہونہار لختِ جگر دو روپے سوا دو آنے کی فکر میں جاگ رہا تھا۔ دل نے کہا:۔

"اُٹھو یہی موقع ہے"۔

لیکن پھر اسی دل نے کہا:۔

"بڑی بُری بات ہے توبہ توبہ کہیں کوئی ایسی بات کرتا ہے"؟
پھر میوہ فروش کی بے مروتی کا خیال آیا اور اس کی بھیانک صورت
آنکھوں کے سامنے آگئی، دل نے پھر کہا:۔

"دیکھا جائے گا، پھر کبھی ایسی بات نہ کرنا لیکن آج تو مجبوری ہے"۔

لیکن اُسی کے ساتھ پھر دل نے کہا:۔

اور اگر کوئی جاگ اٹھا تو؟ پھر خیال آیا چُپکے سے وہیں دبک
رہیں گے لیکن اب بھی ہمت نہ ہوئی اور ادھر میوہ فروش بھانڈا پھوڑنے پر
تُلا ہوا تھا، ہم نے سوچا کہ اگر اس نے گھر پر آکر غُل مچایا تو پھر تھرمامیٹر کا
راز بھی کُھل جائے گا، دل نے پھر مشورہ دیا کہ:۔

"اللہ کا نام لے کر بس ہمت کر ہی جاؤ"۔

ہم بھی ایکی مرتبہ دل میں بسم اللہ کہہ کر اُٹھے اور دبے پاؤں کمرہ
میں پہونچ گئے، اندھیرے میں ٹٹول کر اپنا ہاتھ والد صاحب قبلہ کی جیب
میں ڈالا ہی تھا کہ بلّی نے دودھ کی پتیلی نعمت خانہ سے گرادی اور ہم میز
کے نیچے میز پوش کی آڑ میں سانس روک کر بیٹھ گئے، مگر ماشاء اللہ کیا

بڑھاپے کی نیند بھی ہوتی ہے کہ نہ تو والد صاحب قبلہ کے خراٹے تھمے اور نہ والدہ صاحبہ مدظلہما نے کروٹ بدلی، تھوڑی دیر تک انتظار کرنے کے بعد ہم پھر کوٹ کے پاس پہونچے اور بجائے جیب کے آستین میں ہاتھ ڈال دیا، لیکن اسوقت ہمشیرہ عزیزہ سلمہا کو شرارت سوجھی اور انھوں نے نالۂ نیم شبی پوری تان کے ساتھ بلند کرنا شروع کر دیا، اکی مرتبہ ہم الماری کے پیچھے کھڑے ہو کر دیوار سے چمٹ گئے، خدا خدا کر کے وہ چپ ہوئیں اور ان کو سلا کر والدہ صاحبہ جب سو گئیں تو ہم پسینہ میں ڈوبے ہوئے پھر کوٹ کے پاس آئے اور غڑاپ سے جیب میں ہاتھ ڈال کر مبلغ تین روپئے نکال لئے، اس لئے کہ اسوقت پیسوں کا گننا خواہ مخواہ کی طوالت تھی، ہم نے نہایت احتیاط سے تینوں روپیوں کو دری کے نیچے رکھ دیا اور خود دبے پاؤں چارپائی کے پاس پہونچ گئے لیکن ابھی لیٹے بھی نہ تھے کہ آواز آئی۔

"کون ؟"

ہم یکلخت اچھل پڑے مگر واہ ری حاضر جوابی فوراً کہہ دیا:۔

"پیشاب کرنے گئے تھے"۔

اور اطمینان سے لیٹ کر سو گئے۔

دوسرے دن میوہ فروش پر تو ہمارا اعتماد اسقدر قائم ہو گیا تھا کہ اب اگر ہم سو روپیہ بھی قرض رکھیں تو شاید اس کو کوئی عذر نہ ہوگا لیکن اسکول سے گھر آکر یہ معلوم ہوا کہ کوئی مقدمہ سازش درپیش ہے اور تمام ملازم اسمیں ماخوذ۔ والد صاحب الٰہی کو اپنی پیشی میں دھمکا رہے تھے۔

"اگر بتا دو تو کچھ نہیں ورنہ یاد رہے کہ چمڑی اُتار دوں گا"۔

الٰہی نے ہاتھ جوڑ کر کہا:۔

حضور جو چاہیں کریں لیکن اگر میں نے روپے چھوئے بھی ہوں تو خدا کرے میں ابھی غارت ہو جاؤں"۔

اثر ہونا چاہیئے تھا الٰہی پر مگر ایک دم سے ہم کانپ اُٹھے۔

والد صاحب نے پھر گرج کر کہا:۔

تو تم چور کا پتہ چلاؤ ورنہ یاد رہے کہ سب کو تھانہ بھجوا کر مٹہ بازی کراؤں گا"۔

الٰہی نے پھر دستہ بستہ عرض کیا:۔

"حضور جو چاہیں کریں، اگر میں چور ہوں تو خدا کرے میرے

بال بچّوں کا ناس ہو جائے"۔

ہمارے ہاتھ اور پیر ٹھنڈے ہو گئے۔

والد صاحب نے بقر عیدی کو للکار کر بلایا اور کہا:۔

یقینی تو نے میری جیب سے روپے نکالے ہیں"۔

بقر عیدی نے بلبول بلبول رونا شروع کر دیا اور ادھر ہمارا

بھی دل بھر آیا، والد صاحب نے کہا:۔

"روتا ہے، رونے کی کیا بات ہے، جانتے ہیں تو بتا دے نہیں

تو تجھ سے قبلوا کے چھوڑوں گا"۔

بقر عیدی نے روتے ہوئے کہا:۔

"میاں میں نے اللہ کی قسم، رسول کی قسم روپے نہیں لئے"۔

والد صاحب نے کچھ جاننے کے انداز سے کہا:۔

"ابے تو کون لے گیا؟"

ہمارے دل نے کہا:۔

"ہم"

اور بقر عیدی نے کہا:۔

"میاں مجھے مارڈالے گا جو میں نے لئے ہوں"

ادھر والدہ صاحبہ نقش حیرت بنی بیٹھی تھیں اور بوا جعفری خانم لکچر دے رہی تھیں کہ:۔

"واہ یہ بھی کوئی بات ہے کہ ایک چرائے اور سب کی نظریں نیچی ہوں، اب نہ آپی نے لئے نہ بقر عیدی نے تو پھر سوائے میرے کون رہ گیا، خدا کرے جس نے لئے ہوں آدھی رات کو دم توڑے، ان روپیوں کا خرچ کرنا نصیب نہ ہو، کفن میں لگیں وہ روپے"۔

اگر والد صاحب قبلہ یا والدہ صاحبہ مدظلہا کو معلوم ہوتا کہ ان کا لعل اس بری طرح کوسا جا رہا ہے تو ابھی جعفری خانم صاحبہ کا منہ کچل دیا جاتا لیکن کسی کو کیا خبر تھی، رہ گئے ہم، تو ہم بھی اس نازک موقع پر اس بدزبان گستاخ ملازمہ سے بدلہ نہیں لے سکتے تھے اور چپ تھے لیکن اپنے کو بالکل بے تعلق ثابت کرنے کیلئے ہم نے والدہ صاحبہ سے نہایت بھولے پن سے پوچھا:۔

"یہ کیا ہوا ہے؟"

والدہ صاحبہ نے حیرت سے کہا:۔

"کیا بتاؤں بیٹا! آج تمہارے باپ کی جیب سے تین روپے نکل گئے ہیں، آج تک کبھی ایسی بات نہیں ہوئی تھی اور اگر یہی حال ہے تو ہر چیز اسی طرح پڑی رہتی ہے کل زیور، برتن اور کپڑے بھی چوری ہوا کریں گے، جب گھر ہی میں چور ہوں تو خدا حافظ ہے"۔

ہم نے اور بھی سادگی سے پوچھا:۔

"تو کس نے لئے ہیں وہ روپئے؟"

والدہ صاحبہ نے کہا:۔

"خدا جانے بھیّا کس نے لئے ہیں سب ہی تو انکار کر رہے ہیں"۔

والد صاحب نے سنتے ہی کہا:۔

کسی نے نہیں اس بقرعیدی کے بچّے نے لئے ہیں"۔

اور یہ کہہ کر جو اپنا موٹا سا بید لیکر اُٹھے ہیں تو بقرعیدی مچھلی کی طرح زمین پر تڑپ رہا تھا اور ہمارے قلب کی حرکت بند ہونے کے قریب تھی، بقرعیدی برابر یہی کہہ رہا تھا کہ:۔

"میاں میاں اچھا میں بتاتا ہوں"۔

اور جب والد صاحب اپنا ہاتھ روک کر پوچھتے تھے کہ:۔

"اچھا بتا۔"

تو وہ یہی کہتا تھا کہ :۔

"چاہے جیسی قسم لے لیجئے میں نے نہیں لئے"۔

اور والد صاحب بید کی پھر موسلا دھار بارش شروع کر دیتے تھے یہاں تک کہ جب اس کو مارتے مارتے اُدھیڑ دیا تو یکایک بید کا رُخ آتھی کی طرف ہوا اور اس غریب کو بھی ایسا مارا ہے کہ خدا کی پناہ مگر اس نے بھی نہ بتانا تھا نہ بتایا کہ روپے لئے ہیں، مجبوراً والد صاحب کو تھک کر اس جلادی سے ہاتھ اُٹھانا پڑا، دوسرے ان کا قیمتی بید بھی ٹوٹ چکا تھا، البتہ بُوا جعفری خانم اب بھی چور کو مع اسکے سگے سوتیلوں کے کوس کوس کر کھائے جا رہی تھیں کہ والد صاحب نے آخر ان کو ڈانٹ کر چپ کیا اور حکم دیا کہ بقر عیدی اور آتھی کے جسم پر تھوپنے کے لئے ہلدی پیسیں۔

ادھر ہم کو اچھی خاصی طرح بخار ہو چکا تھا اور بقول والدہ صاحبہ محترمہ کے ہم سہم گئے تھے، بہرحال کچھ بھی ہو اس دن کے بعد سے ہم نے کبھی چوری نہیں کی اور نہ آج تک اس چوری کا اعتراف کیا

آج جب کہ نہ تو والد صاحب اس دنیا میں موجود ہیں اور نہ جعفری خانم یا بقرعیدی یا آکی، لہذا ہم کو اعتراف کرنے میں کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ رہ گئیں والدہ صاحبہ وہ یقیناً اپنے کلیجہ کے ٹکڑے کی اس اخلاقی جراءت پر خوش ہوں گی کہ اس نے بھی کم از کم اس اعتراف جرم کے معاملہ میں اپنے کو گاندھی مہاتما ثابت کر دیا۔

افیونی

افیون تو ایک ایسی چیز ہے جس کو اپنے تاثرات کے اعتبار سے ایک بنگالی اور ایک بھوٹانی، ایک پنجابی اور ایک آسامی کے لئے یکساں ہونا چاہیئے لیکن اس سلسلہ میں لکھنؤ نے جو شہرت حاصل کی ہے وہ شاید دنیا کے کسی حصّہ کو نصیب نہیں ہوئی، بظاہر یہ خصوصیت عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن وہ لوگ جو افیونیوں کو بھی دیکھ چکے ہیں اور اہل لکھنؤ سے بھی ملے ہیں اس خصوصیت کی وجہ سے جانتے ہوں گے کہ "لکھنویت" اور "افیونیت" دونوں اس حد تک متصل ہیں کہ ایک اجنبی کو ایک پر دوسرے کا شبہ ہو سکتا ہے، افیونیوں میں خواہ وہ دُنیا کے کسی حصّہ کے رہنے والے ہوں قدرتی طور پر بہت سی ادائیں ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جو اہل لکھنؤ کے لئے مخصوص ہیں اور لکھنؤ کے اس باشندے میں بھی افیونیوں کی سی شان ہوتی ہے جس بیچارے نے افیون کی کبھی صورت بھی نہ دیکھی ہو، خدا جانے اس مماثلت کی

کیا وجہ ہے لیکن آپ کو چاہیئے کہ ہمارے بیان کی تصدیق کرنے
کیلئے کسی ایسے لکھنوی سے ملئے جو افیونی نہ ہو اور پھر اس کا مطالعہ
اس نظر سے کیجئے کہ اس میں "افیونیت" ہے یا نہیں تو آپ کو ہمارے
بیان کی تائید کرنا پڑے گی، اگر اسی طرح آپ کسی افریقی افیونی کو دیکھئے
تو وہ باوجود اپنی ملکی وحشت کے آپ کو اپنی خاص کیفیت میں بڑی حد تک
لکھنوی نظر آئے گا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افیون کے استعمال کے بعد
انسان اس حد تک شائستہ ہو جاتا ہے کہ اس پر لکھنوی ہونے کا شبہ
کیا جائے ورنہ اس میں شک نہیں رہتا کہ اہل لکھنؤ نے شائستگی افیونیوں
سے لی ہے، بہر حال جو کچھ بھی ہو یہ کچھ

حساب دوستاں در دل

والا قصہ معلوم ہوتا ہے۔

لکھنؤ کے افیونیوں کے متعلق ہم نے اس قدر روایتیں سُنیں
کہ آخر ہم کو کسی لکھنوی افیونی سے ملنے کا شوق پیدا ہوا لیکن جب
اس شوق کی تکمیل نہ ہوئی تو اس نے رفتہ رفتہ آرزو کی صورت
اختیار کر لی، ہمارا یہ شوق غالباً بیجا نہ تھا ذرا تصور تو فرمائیے کہ

ایک تو افیونی اور پھر لکھنوی، یہ دونوں خصوصیات اپنی اپنی جگہ پر تاریخی حیثیت رکھتی ہیں لیکن جب وہ ایک ہی ہستی میں جمع ہو جائیں تو وہ ہستی ہوگی یا قیامت ؟ ایک تو کریلا اور پھر نیب چڑھا، مختصر یہ کہ ہم خدا کی اس عجیب و غریب صنعت کو دیکھنے کے لئے بیچین تھے لیکن اب نہ تو وہ لکھنؤ رہ گیا ہے اور نہ اس کی وہ روائتی خصوصیات باقی ہیں لیکن خداوند کریم تو بڑا مسبب الاسباب ہے، اس نے ہماری جستجو کو ناکام نہ رہنے دیا اور ہم کو بہت جلد میر صاحب سے شرف نیاز حاصل ہو گیا۔

میر صاحب اپنے کو شاہی خاندان سے متعلق بتاتے تھے اور اس کا ثبوت پندرہ روپیہ ماہوار کا وثیقہ تھا جو ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو بغیر کسی دقت کے برابر مل رہا تھا آپ نہ صرف خالص لکھنوی تھے بلکہ نجیب الطرفین افیونی بھی تھے اور اپنی جماعت میں اس خصوصیت کے اعتبار سے اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ ممتاز تھے، گھر کے اکیلے تھے بیوی بچے تو خیر ایک سرے سے تھے ہی نہیں لیکن ان کے علاوہ نزدیک یا دور کے کسی عزیز کا پتہ نہ چلتا تھا، ان کو بیوی بچوں اور عزیزوں کا لطف

اپنی افیون ہی سے حاصل تھا اور وہ اپنے کو افیون کے لئے مٹائے
ہوئے تھے، اسوقت ان کی عمر تقریباً پچاس بلکہ اس سے بھی کم ہوگی
لیکن افیون نے ان کو قبل از وقت پٹاری کا انگور بنا دیا تھا، اس کے
علاوہ ان کی عام صحت کا یہ حال تھا کہ اگر افیون کے عادی نہ ہوتے تو
ان کی موت یقیناً تپ دق سے واقع ہوتی مگر اب بھی وہ غریب کھانسی،
دمہ اور قبض وغیرہ سے پریشان رہتے تھے، توانائی کا یہ حال تھا کہ اگر
مڈیکل کالج کے طلبا، ان کو دیکھ پاتے تو اس زندہ انسانی ڈھانچہ کو کبھی
نہ چھوڑتے اور اپنے کالج کے میوزیم میں مطالعہ کرنے کیلئے یقیناً بند کر دیتے
شکل و صورت کا تو ذکر ہی کیا ضعیفی میں انسان خوبصورت تو نہیں لیکن
خوبصورتوں کو ہنسانیوالی ایک چیز بن جاتا ہے لیکن میر صاحب پر تو معلوم
ہوتا تھا کہ جیسے بڑھاپا پھٹ پڑا ہے کمر بھی اونگھتے اونگھتے جھک گئی تھی،
تمام جسم کی کھال لٹک پڑی تھی، چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ سر
کے اُلجھے ہوئے پٹے بھی بے مرمت پڑے تھے اور کھچڑی داڑھی بھی
آزادی کے ساتھ جدھر چاہتی تھی پھیل رہی تھی، حد تو یہ ہے کہ انگلیوں کے
ناخن بھی قطع و برید سے معاف کر دئے گئے تھے لباس کے معاملہ میں وہ

بہت ہی سادہ دل واقع ہوئے تھے، یہ غور کرنے کی بات کہ خاندان
شاہی کا یہ چراغ نہایت سادہ وضع میں زندگی بسر کر رہا تھا، ان کے
گھر میں کپڑوں کے لئے کوئی بکس، کوئی صندوق یا کوئی صندوقچی نہ تھی،
اور نہ اسکی کوئی ضرورت تھی، میر صاحب کے پاس جسقدر کپڑے تھے وہ سب
ان کے جسم پر رہتے تھے ہم نے تو کبھی بھی ان کے کپڑوں کو دھوبی کے
یہاں جاتے یا دھوبی کے یہاں سے دُھل کر آتے ہوئے نہیں دیکھا بس،
جو کپڑے وہ جسم پر پہنے ہوئے تھے وہ گویا انکی کھال ہو کر رہ گئے تھے
اب اگر آپ ہم سے یہ پوچھیں کہ ان کپڑوں کا کیا رنگ تھا؟ تو ہم صرف یہ
کہہ سکتے ہیں کہ اصلی رنگ کا تو خیر حال معلوم نہیں لیکن کثرت استعمال سے
وہ کپڑے رنگ بدلتے بدلتے اب جس رنگ پر قائم ہو گئے تھے اسکو اصطلاح
عام میں صافی کا رنگ کہتے ہیں، اسی طرح اگر آپ یہ دریافت کریں کہ ان کا
لباس کس کپڑے کا ہوتا تھا یعنی تنزیب یا نین سکھ تو اسکے متعلق عرض ہے کہ
ہمنے میر صاحب کو ہمیشہ موم جامہ زیب تن کئے ہوئے دیکھا ہے جن پر مکھیوں
کی نشست سے ہر وقت مختلف قسم کے نقش و نگار بنتے اور مٹتے رہتے تھے،
البتہ اُن کے کپڑوں کی خوشبو یا بدبو کے متعلق ہم کچھ بھی عرض نہیں کر سکتے

اسلئے کہ یہ علم حاصل کرنے کی ہم کو کبھی جراءت نہیں ہوئی۔

میر صاحب کا دولتکدہ ایک بہت ہی ویران محلہ میں تھا جس کا بیشتر حصہ لکھوری اینٹ اور گارے کی شکل میں مکان کے صحن میں نظر آتا تھا اور جو باقی رہ گیا تھا وہ بھی کوئی تاریخی کھنڈر معلوم ہوتا تھا لیکن میر صاحب کی ضروریات کیلئے ایک مختصر سی کوٹھری کافی تھی جس میں وہ اپنی تمام گرہستی کے ساتھ رہتے تھے اور باقی تمام مکان فی سبیل اللہ چھوڑ رکھا تھا۔

میر صاحب کی مختصر سی کوٹھری میں ایک تو تھی وہ چارپائی جو شاہی زمانہ کے کھٹ بُنوں نے اپنے ہاتھ سے بُنی تھی، حالانکہ اب وہ اپنی بوسیدگی کے اعتبار سے ٹوٹی ہوئی قبر معلوم ہوتی تھی لیکن میر صاحب اس حالت کو بہت غنیمت سمجھتے تھے بہ نسبت اسکے کہ آجکل کے بدتمیز کھٹ بُنے اس تاریخی چارپائی میں ہاتھ لگائیں، اس چارپائی پر کچھ بستر تھا تو ضرور لیکن صحت کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کیا تھا اور کن کن چیزوں پر مشتمل تھا، چارپائی کے علاوہ اس کوٹھری میں جس چیز کو نمایاں حیثیت حاصل تھی وہ حقہ تھا، اس حقہ کے متعلق یہی بیان کیا جاسکتا ہے کہ میر صاحب کے داداجان مرحوم و مغفور کو غدر کے زمانہ میں کسی شاہی محل میں پڑا ہوا ملا تھا اور وہ ابتک نہایت حفاظت کے

ساتھ سینہ بسینہ چلا آرہا تھا، میر صاحب نے تو بہ نظر احتیاط اسکو کبھی پانی سے تازہ تک نہیں کیا تھا اور نہ اس کا پانی سال بھر پہلے بدلتے تھے البتہ اسکی چلمیں جب سے ابتک چار پانچ مرتبہ ضرور بدلی گئی تھیں اور اسمیں بھی میر صاحب کی بد احتیاطی کو دخل نہ ہوتا تھا بلکہ یہ ہوتا تھا کہ جہاں میر صاحب کی آنکھ جھپکی اور حقہ اُلٹ کر زمین پر آرہا بس اسی میں چلمیں ٹوٹ گئیں، چارپائی اور حقہ کے بعد تین کے سماوار کا نمبر تھا جو ہر وقت گرم رہتا تھا اور جسمیں ہر وقت چائے موجود ہوتی تھی، ان چیزوں کے علاوہ چائے کی پیالی، کُلّوں کی ٹوکری کچھ ٹھیکرے کچھ گلھڑ، کچھ روڑے، گلگلسو کا ڈبہ جس میں خمیرہ تنباکو رکھا جاتا تھا ایک اسٹول جس پر گول چینی کی پیالی کاتبوں کی دوات کی طرح رکھی تھی ایک آگ دھونکنے والی دفتی، کچھ آگ سُلگانے کے لئے گودڑ، ایک آبخورہ ایک گھڑا، ایک تامچینی کا ڈونگا اور ایک دیا سلائی کی ڈبیہ بھی تھی، ان ہی تمام چیزوں کی میر صاحب کو ضرورت بھی تھی اور ان ہی سے وہ اپنی ضروریات پوری کرتے تھے لیکن زیادہ تر توجہ اسٹول پر رکھی ہوئی پیالی کی جانب رہتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ ان کی زندگی اسی پیالی میں بند ہے۔

میر صاحب کا زیادہ تر وقت اسی گوشۂ عافیت میں گزرتا تھا لیکن ہر روز کم از کم ایک مرتبہ آپ اپنے ایک دوست کے مکان پر ضرور جاتے تھے

جہاں آپ کے تمام ہم مشرب یکجا ہو کر تھوڑا سا وقت دلچسپی کے ساتھ گزارتے تھے اس اجتماع میں بڑے بڑے ملکی اور قومی، سیاسی اور معاشرتی، ادبی اور تمدنی، اخلاقی اور علمی مسائل پر بحث ہوتی تھی، واقعات حاضرہ پر رائے زنی کی جاتی تھی اور دنیا کے اہم سے اہم معاملات نہایت غور و فکر کے بعد طے پاتے تھے اور اس انجمن میں میر صاحب کو وہی درجہ حاصل تھا جو کسی ذمہ دار کانفرنس کے صدر کو حاصل ہوتا ہے انکی رائے قطعی اور فیصلہ کن سمجھی جاتی تھی اور ان کے تبحر، تدبر اور تجربہ کاری کا تمام ہمعصروں پر بڑا اثر تھا اور واقعہ بھی یہی تھا کہ اپنے یاران میکدہ میں میر صاحب سب سے زیادہ کہنہ مشق اور سب سے پرانے افیونی تھے۔

ان باتوں کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے تاکہ آپ اندازہ کرتے کہ ہمارے میر صاحب کس پایہ کے افیونی تھے۔

میر صاحب کی زندگی کا مطالعہ کرنے کیلئے ہم نے ان کے ساتھ بہتر سے بہتر تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی یہاں تک کہ انکی افیون کے اخراجات کا ٹھیکہ لے لیا جس کے بعد میر صاحب کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ ابھی تک دنیا باوفا دوستوں سے خالی نہیں ہوئی ہے۔

میر صاحب پر اس طرح قابو حاصل کر لینے کے بعد ہم نے ان کی خاص سوسائٹی میں بھی داخل ہونا شروع کر دیا اور نہایت خاموشی کیساتھ اس نئی دنیا کی سیر کرتے رہے میر صاحب کا معمول تھا کہ اپنے دوستوں کے مجمع میں جاتے ضرور تھے لہذا ہمنے بھی ان کے ہمراہ جانا شروع کر دیا، اور وہاں جا کر صحیح معنوں میں ایک نئی دنیا دیکھی جس کمرہ میں اس کانفرنس کے اجلاس ہوتے تھے اسکے وسط میں ایک بڑا سا پتیلہ چولھے پر چڑھا رہتا تھا جسمیں چائے دم ہوتی تھی اور اس پتیلہ کے چاروں طرف میر صاحب کے تمام دوست حلقہ باندھ کر بیٹھتے تھے اور سب کے سامنے کچھ نہ کچھ ہوتا ضرور ایک کسی کے سامنے چائے کی پیالی ہوتی تھی تو کوئی کلھڑ لئے بیٹھا ہوتا ایک کسی کے آگے حقہ ہوتا تھا تو کوئی اپنی عزیز از جان پیالی میں چٹکی ڈالے بیٹھا ہوتا تھا کسی کے ہاتھ میں طلسم ہوشربا کی کوئی جلد ہوتی تھی تو کوئی گھٹیوں سے شغل کرتا ہوا نظر آتا تھا مختصر یہ کہ ہر ایک کسی نہ کسی کام میں مصروف ضرور ہوتا تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ اہم ترین معاملات پر تبادلہ خیال کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ کسی نے کہا ــــــــ

(ہر جگہ نون غنہ بڑھا کر پڑھئے)

"اماں بھائی غنیمت ہے جو ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں"۔

دوسرے بولے۔ "ارے یار پھر کہاں ہم اور کہاں یہ صحبتیں مر کر چلے جائیں گے، پھر ہم ہوں گے اور قبر کا کونا"۔

تیسرے نے کہا۔ "سچ ہے بھائی، اللہ بس باقی ہوس"۔

چوتھے نے فرمایا۔ "خدا معلوم کیا حشر ہو بڑے گناہ کئے ہیں"۔

پانچویں بولے۔ "واللہ ہم سا روسیاہ بھی دنیا میں کوئی نہ ہوگا، نہ نماز کے نہ روزے کے آخر خدا کو کیا منہ دکھائیں گے، بھائی اور چاہے جو کچھ کرو نماز ضرور پڑھ لیا کرو، بڑی برکت ہوتی ہے اور سارے گناہ معاف ہو جائیں گے، یہ نماز نہ پڑھنا تو جہنم کی سیر کرائے گا"۔

میر صاحب نے فرمایا۔ "اماں لاحول ولا قوۃ کیسی باتیں کرتے ہو، خداوند کریم بڑا رحیم ہے، اماں وہ ہم کو نہ بخشے گا تو کیا فرنگیوں کو بخشے گا، بھائی ہم کلمہ تو پڑھتے ہیں، ان گنہگاروں کو دیکھو جو دنیا کے گناہ کرتے ہیں اور پھر ہم پر بادشاہت کرتے ہیں مگر وہاں جا کر پتہ چلے گا"۔

ایک اور صاحب کہنے لگے۔ "کیا بات کہی ہے واللہ میر صاحب یہ انگریزوں کی شاہی بھی گاندھی نے کرکری کر دی، سنا ہے کہ اب تو

لڑائی ہونے والی ہے"۔

پیر صاحب۔ "اماں جاؤ بھی گاندھی بیچارہ کیا کرتا وہ تو کہو کہ سرکار نے ڈھیل چھوڑ رکھی ہے نہیں تو توپ کے منھ پر باندھ کر اُڑا دیتی سرکار سے کوئی کیا لڑے گا۔ ہزاروں بندوقیں، توپیں، تیر وکمان، تلوار سب ہی تو اسکے پاس ہیں سُرمہ کر دے جو کوئی سر بھی اُٹھائے، اماں آج چاہے تو بموں میں بارود بھر کر سارے شہر کو اُڑا دے۔ ہوائی جہاز سے آگ برسا دے، ریلوں کو لڑا دے، موٹروں سے کچل دے، اماں ایک ہوائی جہاز ایسا ہے کہ سب کچھ کر سکتا ہے"۔

ایک صاحب نے فوراً آنکھیں کھول کر فرمایا۔ "ارے بھائی پیر صاحب خوب یاد دلایا، یار، ان ہوائی جہازوں سے تو بڑی بے پردگی ہوتی ہے سب پردہ دار عورتوں کو یہ لوگ دیکھتے ہوں گے"؟

دوسرے صاحب کہنے لگے۔ "ہاں بھائی کل ہی کا ذکر ہے کہ ایک ہوائی جہاز میرے مکان پر نکلا مگر بہت نیچا تھا میں نے بھی لڑکے کا لنگڑ لیکر جو اس پر مارا تو قسم ہے آپ کے سر عزیز کی بس ذرا سا بچ گیا نہیں تو زمین پر ہوتا اور ہڈی پسلی سُرمہ ہو گئی ہوتی"۔

میر صاحب نے تجویز پیش کی "بھائی تو اب کیا کیا جائے عورتوں کو انگنائی میں نہ نکلنے دیا کرو، ایک شامیانہ لیکر لگا دو۔"

اس کے بعد پردہ کا مسئلہ چھڑ گیا اور پھر یورپ کی آزادی پر تبصرہ ہونے لگا، انگریزوں کی دولت کا ذکر ہوا، اُن کی تندرستی، اُنکی غذا، اُن کے لباس، اُن کی معاشرت، انکی گندگی، ان کے کتوں، ان کی میموں، ان کے بچوں کا تذکرہ ہوا، بے فکری اور فارغ البالی کے موضوع پر دُھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ ہندوستان کے افلاس پر اظہار افسوس کیا گیا، ہندو مسلم کشیدگی پر دیر تک بحث ہوتی رہی، سوراج کے امکان پر تبادلہ خیال ہوا، جنگ کے آثار کا اندیشہ ظاہر کیا گیا، جنگ کے ہولناک نتائج بیان کئے گئے اور پھر قرب قیامت کے وعظ کے بعد ایک صاحب نے تجویز پیش کی کہ ہم سب نماز شروع کر دیں اور اگلی رمضان میں روزے ضرور رکھیں، افطاری کی فہرست مرتب ہوئی اور یہ دلچسپ کارروائی ایک صاحب کے چائے کی طرف متوجہ ہونے سے ادھوری رہ گئی جسکے بعد سب نے چائے نوشی شروع کر دی اور پھر وہی دور شروع ہوا جس کے ساتھ ساتھ کوئی تو اپنی خاندانی فیاضی کے افسانے سُناتا رہا، کوئی اپنے

والد مرحوم کے کارنامے بیان کرتا رہا کسی نے اپنی جوانی کی رنگین داستان چھیڑ دی اور میر صاحب نے اپنے خاص انداز بیان میں واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے محلات کا ذکر شروع کیا جو نہیں معلوم کہاں کہاں ہوتا ہوا الہ آباد کی نمائش پر آکر ختم ہوا، ایک صاحب جو دیر سے اپنے گھٹنوں میں سر دئے ہوئے بیٹھے تھے ذرا سا اُبھرے اور سب کو داستان امیر حمزہ کی طرف متوجہ کیا جس کی سب نے تائید کی اور ایک صاحب نے شروع کر دیا، داستان کا پڑھنا اور سب آنکھیں بند کر کے سُننے لگے، وہ حضرت داستان پڑھ رہے تھے، داستان کے ایک ایک فقرے پر ایکٹنگ بھی فرماتے جاتے تھے لیکن سامعین کا یہ حال تھا کہ رفتہ رفتہ سب کے سر گھٹنوں میں گھُستے جاتے تھے صرف داستان گو کی آواز کمرہ میں گونج رہی تھی، باقی سب پر ایک سکوت بلکہ موت کی سی کیفیت طاری تھی۔

لاٹری کا ٹکٹ

یہ ہماری ہی شامت تھی کہ ننھے نواب کو شوق دلا دلا کر لاٹری کا ایک ٹکٹ خریدنے پر آمادہ کر دیا لیکن ہم کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ ایک روپیہ کا ٹکٹ لیکر ایک لاکھ روپے کو بلا شرکت غیرے اپنی دولت سمجھنے لگیں گے لیکن جس دن سے انھوں نے ٹکٹ لیا بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک لاکھ روپیہ اُن کی جیب میں ہے اور وہ اسکے مالک و مختار ہیں کہ جس طرح دل چاہے صرف کریں، وہی بڑے آدمیوں والی بڑی باتیں تھیں اور وہی روپے والوں والا استغنار، اب تو اس بیکسی و بے بسی کا کہیں پتہ بھی نہ تھا جو روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے خود بخود انسان میں پیدا ہو جاتی ہے بلکہ بجائے نون تیل لکڑی کے اب ان کو موٹر، کوٹھی اور بینک کی فکریں تھیں۔ پہلے تو ہم کو ان کے اس شیخ چلی پن پر ہنسی آتی رہی لیکن جب ہم نے سمجھ لیا کہ وہ مذاق میں سنجیدہ ہیں تو ہم نے دل ہی

دل میں اپنے کو بڑی لعنت ملامت کی کہ کیوں ایک اچھے خاصے آدمی کو لاٹری کا ٹکٹ دلا کر بدحواس کر دیا لیکن اسمیں سچ پوچھئے تو ہمارا کوئی قصور نہ تھا۔ لاٹری کا ٹکٹ ہم بھی ہمیشہ خریدتے ہیں اور ہماری طرح لاکھوں دوسرے آدمی، مگر خدا نہ کرے کہ کسی کا دماغ اس طرح خراب ہو جس طرح ننھے نواب کا سر پھر گیا تھا، اب تو ان کے پاس سوائے لکھ پتی آدمیوں کی باتوں کے اور کوئی بات ہی نہ تھی، وہی خیالی پلاؤ پکتے تھے، وہی ہوا میں قلعوں کی تعمیر ہوتی تھی اور وہی موٹر، کوٹھی، سیر و سیاحت اور بینک کے تذکرے ہوتے تھے، کہنے لگے:۔

"حضرت گنج، بنارسی باغ، بندریا باغ وغیرہ کے حلقہ میں اگر کوئی قطعہ آراضی برائے فروخت ہو یا کوئی کوٹھی بکنے والی ہو تو خیال رکھنا"۔

ہم نے کہا "کیوں دماغ خراب کر رہے ہو، ابھی سے قطعۂ آراضی کی بھی فکر ہو گئی"۔

سنجیدگی سے کہنے لگے "میاں یہ نہ کہو، خدا کو دیتے دیر نہیں لگتی، اور میرا تو دل گواہی دے رہا ہے کہ اسی بہانے سے خدا کو مجھے خوش حال بنانا منظور ہے"۔

میں نے کہا "ارے یار سب کچھ سہی مگر پہلے خدا کو وہ دن تو دکھانے دو۔"

ہنسکر اور خوشی سے تھوڑا پھول کر بولے "خدا تو خیر جو کچھ کرے گا وہی ہو گا مگر ہم کو تو اپنے انتظام سے بے فکر نہ رہنا چاہیئے۔ میں واقعی تم سے کہتا ہوں کہ اس قسم کی زمین یا کوٹھی پر نظر رکھنا۔"

ہم نے بھی یہ سمجھ کر کہ اگر بیچارہ خوش ہو رہا ہے تو ہمارا کیا نقصان ہے ان سے کہہ دیا کہ :-

"اچھی بات ہے میں خیال رکھوں گا۔"

اب ننھے نواب کو صبح سے لیکر شام تک یہی کام تھا کہ جس سے بھی ملتے مناسب سی کوٹھی اور موزوں قطعہ آراضی نظر میں رکھنے کی استدعا کرتے، لوگ پوچھتے کہ نواب آخر کہاں ہاتھ مارا تو آپ نہایت انکسار کے ساتھ صرف یہی کہتے تھے کہ ع

تمہاری دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال

رفتہ رفتہ آپ کے تمام حلقۂ احباب و اعزہ میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ ننھے نواب کے مکان میں کوئی مدفون خزانہ نکلا ہے یا گھوڑدوڑ میں کوئی لمبی بازی جیت گئے ہیں اور ننھے نواب کا یہ حال تھا کہ آپ ان قیاس آرائیوں سے

پھولے نہ سماتے تھے اور شیخ چلّی پن روز افزوں ترقی کے ساتھ جاری تھا یہاں تک کہ اب مارے خوشی کے راتوں کو نیند حرام ہوگئی تھی اور تمام تمام دن اسی مشغلہ میں گزرنے لگا کہ کسی موٹر کمپنی میں جاکر موٹر دیکھ آئے کسی مالک مکان سے خریداری کے متعلق بات چیت کرلی کسی انشیورنس کمپنی سے اسکے قواعد وضوابط پوچھ لئے اور پھر مصیبت یہ تھی کہ ان تمام لغویات کی تفصیلات ہم سے بیان کیجاتی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ شکایت بھی ہوتی تھی کہ ہم اس معاملہ میں قطعاً دلچسپی نہیں لے رہے ہیں حالانکہ ہم کو یہ فکر تھی کہ جب لاٹری کے نتائج نکلیں گے اُسوقت ہم اس غریب کو کیونکر سنبھالیں گے اور کس منھ سے تسلّی دیں گے، ایک دن کہنے لگے کہ:۔

"بھائی آج جو کچھ بھی ہوجائے تم کو میرے ساتھ چل کر زمین دیکھنا پڑیگی، واللہ سات ہزار کی زمین ہے اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ کوڑیوں کے مول مل گئی، ایک کوٹھی مع چمن کے نہایت عمدگی کے ساتھ بنے گی، میری رائے ہے کہ تم چل کر اس زمین کو دیکھ لو اور اپنی رائے سے نقشہ بنوادو اب تم ہی دیکھو کہ وقت کس قدر کم رہ گیا ہے، پھر ہم تم اور تمھاری بھاوج بلکہ اگر تمھاری رائے ہو تو ہماری بھاوج صاحبہ سب سفر کو نکل جائیں گے،

میں چاہتا ہوں کہ یہ انتظامات پہلے ہی سے ہو جائیں اور تمام کام

بالکل لیس رہے"۔

میں نے ہنس کر کہا۔"نواب کچھ سر پھر گیا ہے"؟

کہنے لگے۔"سر پھرنے کی کون سی بات ہے، کیا خدا کی قدرت سے

بعید ہے کہ مجھ کو لکھ پتی بنا دے"۔

میں نے کہا۔"خدا تو سب کچھ بنا سکتا ہے مگر خدا نہ کرے کہ کسی کو

پاگل بنائے"۔

کہنے لگے۔"یعنی"؟

میں نے کہا۔"یعنی یہ کہ لکھ پتی تو خیر تم بعد میں بنائے جاؤ گے

مگر ابھی تو صرف پاگل بنا دئیے گئے ہو"۔

کچھ برہم ہو کر بولے۔"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھ کو خواہ مخواہ

مایوس ہو جانا چاہیئے"؟

میں نے کہا۔"ہاں اس قسم کے معاملات میں مایوس ہی رہنا چاہیئے"۔

نواب یہ سُن کر آبدیدہ ہو گئے اور مجھ کو ان کی حالت زار پر کچھ ایسا

بیساختہ ترس آیا کہ میں نے گھبرا کر کہا۔

"ارے یار میں تو مذاق کر رہا تھا، میں ابھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں"۔

نواب نے جھٹ اپنے آنسو پی لئے اور بشاش ہو کر بولے:۔

"تو پھر چلو نا"۔

میں نے کپڑے پہنے اور اُن کے ہمراہ ہو لیا، ابھی گھر سے تھوڑی ہی دور ہم دونوں گئے ہوں گے کہ ایک لالہ نے نواب کو سلام کر کے روک لیا اور کہنے لگا کہ:۔

"ابکی تو نواب صاحب بہت دیر ہو گئی"۔

نواب نے لاپرواہی سے ہنس کر کہا:۔

"ارے تو مرے کیوں جاتے ہو، ابکی ۱۵ ر اگست کو جتنی ضرورت ہو تم خود مجھ سے لیجانا"۔

لالہ نے کہا۔ "نہیں نواب میاں اب تو ملنا چاہیئے"۔

کہنے لگے۔ "بھائی کہہ تو دیا ہے کہ پندرہ تاریخ کو آج کے چھٹے روز تم مجھ سے خود سو دو سو جتنی ضرورت ہو لیجانا، روپیہ آ رہا ہے اور جس دن آ گیا میں خود تم کو خدا کے فضل سے بھر دینے کے قابل ہو جاؤں گا"۔

لالہ کو کچھ تو حیرت تھی اور کچھ وہ نواب کی ان باتوں کو جھوٹ

سمجھ رہا تھا، اس نے حیرت سے اپنا منھ کھولا ہی تھا کہ نواب نے اس کی

پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا:۔

"میاں بس۔ ع

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال"

اور ہنستے ہوئے آگے چل دئے، سامنے ہی ایک جوہری کی دوکان تھی، کہنے لگے۔

"بھائی ذرا یہاں ایک چیز دیکھنا ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا؟"

کہنے لگے: "ہے ایک چیز از قسم زیور، ذرا تم بھی رائے دیدو گے"۔

میں کچھ اور کہنے ہی والا تھا کہ آپ نے دور ہی سے جوہری کو مخاطب

کرتے ہوئے کہا:۔

"کہو سیٹھ جی! کوئی چیز ہمارے کام کی بھی ہے"؟

جوہری نے ہاتھ جوڑ کر کھیسیں نکالتے ہوئے کہا:۔

"نہیں حضور ہم چاندی کا تو کاروبار ہی نہیں کرتے"۔

بس ہمارے نواب بگڑ گئے۔

عجب آدمی ہو تم چاندی کا کاروبار، چاندی سے کیا تعلق، آدمی

دیکھ کر بات کیا کرو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی مناسب سی چمپا کلی جڑاؤ ہے یا نہیں؟"

اب جوہری نے کھڑے ہو کر نواب کو اور ان کے طفیل میں ہم کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا اور آنکھیں بچھاتا ہوا دوکان میں لے گیا، نواب نے ایک ایک زیور دیکھنا شروع کیا، کبھی چمپا کلی پرکھتے ہیں تو کبھی جھومر کی قیمت پوچھتے ہیں، کبھی کرن پھول اٹھاتے ہیں تو کبھی پتّے بالیاں طلب فرماتے ہیں، یہاں تک کہ آخر میں آپ نے اپنی "گھر میں" کے لئے ایک جڑاؤ ہار پسند فرمایا، جس کی قیمت سات سو بتّیس روپیہ نو آنے چھ پائی تھی، مجھ سے کہنے لگے :۔

"کیوں بھئی! مناسب رہے گا نا تمہاری بھاوج کے لئے؟"

میں نے سر تسلیم خم کر کے کہا۔ "جو مزاج یار میں آئے"۔

کہنے لگے۔ "واقعی بتاؤ"۔

میں نے کہا۔ "کہہ تو دیا کہ ہاں مناسب ہے یہی"۔

بس آپ نے فیصلہ کن انداز سے سیٹھ جی کی طرف دیکھا اور کہا۔

"اس کو الگ رکھ لیجئے پندرہ تاریخ کو میں خود آؤں گا یا کوئی آدمی

آکر قیمت دے جائے گا اور لے جائے گا"۔

سیٹھ جی نے کھیسیں نکال کر دونوں ہاتھ جوڑے اور پیشانی پر رکھ کر وہ سلام کیا جس کو صحیح معنوں میں "دست بستہ" سلام کہہ سکتے ہیں مجھ کو نواب پر ہنسی سے زیادہ ترس آرہا تھا اور ترس سے زیادہ ہنسی مگر نواب بالکل سنجیدہ تھے، اکڑتے ہوئے جوہری کی دوکان سے نکلے اور کہنے لگے :۔

"میں نے ایک بزرگ سے پوچھا تھا وہ تو دم قعی اس ۷۷۹۵۰ کو نہایت مبارک بتاتے ہیں، میں نے اُن سے دعا کرنے کیلئے بھی کہا ہے، یار مجھ کو تو ہر طرف سے کامیابی ہی کامیابی نظر آتی ہے، کل رات کو خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ کانسہ ہاتھ میں لئے بھیک مانگ رہا ہوں اور تنہا نہیں ہوں بلکہ تمہاری بھاوج بھی پیچھے پیچھے چھوٹے بچہ کو گود میں لئے ہوئے آواز ملاکر صدا لگا رہی ہیں اور بڑا بچہ میری انگلی پکڑے ہوئے ہے، اس وحشت ناک خواب سے یکایک چونک پڑا اور تمہاری بھاوج کو اٹھاکر تمام خواب من و عن سُنا دیا، وہ ہنسیں اور کہنے لگیں کہ خواب کی تعبیر اُلٹی ہوتی ہے تو اسکے معنی یہی ہوئے کہ میں دولتمند ہونے والا ہوں"۔

میں نے ہنسی کو بہ مشکل ضبط کرتے ہوئے کہا:۔

"واقعی خواب تو نہایت مبارک ہے اور بقول اُن بزرگ کے نمبر بھی مبارک ہے"۔

کہنے لگے "تمہیں دیکھو جو تم یہ کہا کرتے ہو کہ مایوس ہو جانا چاہیئے"۔

میں نے کہا: "میں اس لئے مایوس ہونے کا مشورہ دیتا ہوں کہ مایوسی کے بعد ہر خوشی اور ہر کامیابی صحیح معنوں میں کامیابی معلوم ہوتی ہے اور اس وقت مسرت کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہوتا"۔

چلتے چلتے ایک دم سے رُک گئے اور کہنے لگے:۔

"دیکھو یہی ہے وہ زمین جس کا میں نے تم سے تذکرہ کیا تھا"۔

زمین واقعی اچھی تھی بشرطیکہ روپیہ ہوتا لیکن اسوقت تو ہم کو ہر اچھی اور بُری زمین کی تعریف کرنا تھی اور صرف زبانی جمع خرچ کا معاملہ تھا لہٰذا ہم نے ان سے اتفاق کرتے ہوئے کہا:۔

"واقعی زمین اچھی ہے اور اس میں کوٹھی اس قدر موقع سے بنے گی کہ جواب نہ ہوگا"۔

خوش ہو کر اور خوشی میں نکل آنے والا پسینہ پونچھ کر بولے:۔

"ہے نا؟ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس قسم کی زمین دُچھکے سے
کان میں ۱۷۰ ہزار کی بھی مفت ہے"۔

ہم نے تھڑکی بہ ترکی کہا "واقعی مفت ہے"۔

نواب پہلے تو اپنی چھتری سے زمین پر ادھر ادھر لکیریں کھینچتے
رہے، پھر بولے:۔

"میرے خیال میں اس کا نقشہ کسی انگریز نقشہ نویس سے بنوایا جائے"۔

میں نے کہا "تو کیا تمہارا ارادہ کسی ہندوستانی سے بنوانے کا
تھا، کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا"۔

ہنسے اور کہنے لگے "نہیں میں ایسا احمق نہیں ہوں تم دیکھنا کہ
کیسی کوٹھی بنتی ہے اس کو تو لوگ دور دور سے دیکھنے آئیں گے"۔

ایک طرف جا کر کہنے لگے:۔

"دیکھو یہاں باغ رہے گا اور یہ شاگرد پیشہ، موٹر وغیرہ کیلئے
وہ بغل والی جگہ ہے"۔

میں نے بھی صاد کر دیا۔ کہنے لگے:۔

"تو اب کل ہی کسی نقشہ نویس کے پاس چلنا چاہئیے اور وہاں دیکھو

اس زمین پر جو کوٹھی ہو گی اس میں بجلی کی روشنی بھی آسانی سے آ جائیگی۔ اور یہ جگہ اسٹیشن وغیرہ سے بھی دور نہیں ہے، پھر کھلی ہوئی آب و ہوا۔"

میں نے گردن ہلا کر تائید کی اور ہم دونوں یہی ہوائی قلعہ بناتے ہوئے واپس آ گئے۔ گھر آ کر ہم نے یہ طے کر لیا کہ اب جبتک لاٹری کا نتیجہ نہ آ جائے گا ہم ننھے نواب سے نہ ملیں گے، گھر میں ہوں گے تو کہلوا دیں گے کہ نہیں ہیں اور بازار میں ان سے آنکھ بچا کر چلیں گے۔

ننھے نواب بلا ناغہ غریب خانے پر آتے رہے لیکن ان کو یہی معلوم ہوتا رہا کہ ہم ابھی ابھی کہیں چلے گئے ہیں یا بڑی دیر کے گھر سے نکلے ہوئے ہیں لیکن بدقسمتی سے ایک دن ہم باہر ہی بیٹھے ہوئے مل گئے نواب نے آتے ہی طنزاً کہا:۔

"اجی حضرت اب تو آپ عید کا چاند ہو گئے ہیں، پتہ ہی نہیں ملتا نقشہ لئے لئے مارا مارا پھرتا ہوں مگر سرکار ہیں کہ غائب۔"

عرض کیا۔ "کیا بتاؤں بھائی ملازمت بندگی بیچارگی ہے، کچھ سرکاری غپ شپ تھی"۔

کہنے لگے: "اور وہ لاٹری کا نتیجہ بھی غائب ہے، آج پندرہ کے بجائے سترہ ہوگئی"۔

ہم نے کہا۔ "نتیجہ آنے ہی والا ہے"۔

کہنے لگے۔ "خیر وہ آتا رہے گا تم یہ نقشہ تو دیکھو"۔

ہم نے نقشہ لیا ہی تھا کہ ملازم نے ڈاک لاکر دی جس میں اخبار کھول کر سب سے پہلے لاٹری کا نتیجہ دیکھا، لاٹری جیتنے والوں کی طویل فہرست تھی، ننھے نواب بھی چشمہ لگا کر اخبار پر ٹوٹ پڑے اور "۹۵۰" کی جستجو شروع ہوگئی، آدھ گھنٹہ تک اخبار ٹٹولتے رہے مگر اخبار میں وہ نمبر ہو تو پتہ چلے آخر تھک کر گھبرائی ہوئی آواز میں بولے:۔

"ایں یہ کیا؟"

میں نے منہ لٹکا کر کہا۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا"۔

کہنے لگے۔ "یقیناً کوئی غلطی ہوئی ہے یعنی "۹۴۹" موجود ہے اور "۹۵۱" کو بھی ایک ہزار والا انعام ملا ہے مگر بیچ سے "۹۵۰" کدھر غائب ہوگیا"؟

ان کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور رنگ بالکل زرد

پڑ گیا تھا، میں نے ان کو سنبھالنے کا یہی بہترین طریقہ سمجھا کہ ان سے

کہہ دیا،۔

"اس قسم کی غلطیاں ہمیشہ ہو جاتی ہیں، اکثر نمبر رہ جاتے ہیں

جو بعد میں شائع ہوتے ہیں"۔

کہنے لگے۔ "تو پھر تار دیدوں، بلکہ جوابی تار؟"

میں نے کہا۔ "اچھا تو ہے"۔

نواب اپنی کوٹھی کا نقشہ پڑا ہوا چھوڑ کر تار گھر روانہ ہو گئے،

تعجب ہے کہ ان کا دم نہیں نکلا۔

ہوم ممبر

جس کا باپ زندہ ہو وہ کسی کے باپ کا نوکر کیوں بنے اور واقعی اس کو شرفاء میں بدشگونی سمجھا جاتا ہے کہ باپ کی زندگی میں اس کا لختِ جگر دوسروں کی غلامی کر کے اپنا پیٹ پالے، یہ نوکری چاکری تو بس اُن لوگوں کے لئے ہے جو شفقتِ پدری سے محروم ہو کر یتیم ہو گئے ہیں، اور جن کا دنیا میں کوئی سہارا نہیں ہے، غالباً یہی وجہ تھی کہ ہم فارغ التحصیل ہونے کے بعد جب گھر آئے تو ہمارے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی یہ خیال نہ تھا کہ ہم کو اب کچھ اور بھی کرنا ہے، شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے اور موج اُڑاتے تھے البتہ چونکہ دادا جان مرحوم ومغفور کا انتقال ہو چکا تھا لہذا والد صاحب قبلہ کو تو نوکری کرنا ہی پڑی تھی لیکن ہمارے سر پر بفضلہ باپ کا سایہ قائم تھا لہذا ہم کو کیا ضرورت تھی کہ ہم خواہ مخواہ چکّی پیسیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ دنیا حاسدوں کی بستی ہے لہذا ہماری اس آزادی اور فارغ البالی کو کیوں کر اچھی نظر سے

دیکھا جاسکتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد سے ہمارے
تمام خاندان والوں کے لئے ہماری یہ آزادی ہی اہم ترین بحث بن گئی
ہر ایک کو اپنی اپنی فکریں چھوڑ کر بس ہماری ہی فکر تھی کہ ہم کیوں آزاد
ہیں اور ہم کو خود ان کی طرح کولھو کا بیل کیوں نہیں بنایا جاتا، والد صاحب
قبلہ کو ہماری طرف سے بھڑکانے کا منظم پروپیگنڈا ہو رہا تھا اور ہمارے
خلاف سازشوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔

ہم بیٹھے ہوئے شطرنج کھیل رہے تھے کہ والد صاحب کے کمرہ میں
جناب خالو صاحب قبلہ نے رعد نما آواز سے فرمایا:۔

"بیکاری انسان کو نہ صرف آرام طلب بنا دیتی ہے بلکہ دنیا کے
کسی کام کا نہیں چھوڑتی"۔

والد صاحب نے حقّہ کا طویل کش لیتے ہوئے فرمایا "تو بھائی
کچھ تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ بی، اے پاس کرا کے کلرکی کرانے
سے رہا اور ڈپٹی کلکٹری ملتی نہیں"۔

بی، اے خاندان بھر میں سوائے ہمارے اور کوئی نہ تھا لہذا ظاہر
ہے کہ یہ گفتگو ہمارے ہی متعلق تھی چنانچہ ہم قبل سے شہ دینے کے بجائے

اپنے ہی رُخ کو بٹوا بیٹھے اور اس کی بھی کوئی پرواکئے بغیر کان لگاکر اپنے متعلق اس مناظرے کو سننے لگے۔

خالو صاحب نے ڈکار لیتے ہوئے کہا:۔

"صاحبزادے کا حال یہ ہے کہ دن رات تاش، شطرنج اور کیرم کی بازیاں گرم رہتی ہیں اور اوباش دوستوں کے مجمع میں ہاہاہوہو ہوا کرتی ہے آخر کب تک اس طرح وقت برباد ہوگا۔"

ان خالو صاحب کو ہمارے ساتھ صرف اس لئے دشمنی تھی کہ ہم مستقبل قریب میں انھیں حضرت کی فرزندی میں جانیوالے تھے لہذا وہ اپنی صاحبزادی کے آرام کی وجہ سے ہماری جڑیں کاٹنے پر تُلے ہوئے تھے، دل میں تو آیا کہ اسیوقت ایک کاغذ اٹھاکر لکھ دیں کہ ہم کو آپکی دامادی قبول نہیں ہے لیکن والد صاحب نے ہمارے دل کی بات کہہ دی:۔

"بھائی سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کی ذلیل نوکریاں کرانے سے تو بیکار بٹھا رکھنا اچھا ہے۔"

ہم نے اپنی جگہ پر خوشی سے اُچھل کر دل ہی دل میں کہا ؎

مؤذن مرحبا بروقت بولا تری آواز مکّے اور مدینے

خالو صاحب جو غالباً ہمارے ٹھیکہ دار ہو چکے تھے پھر ٹر ائے،

"بھائی صاحب قبلہ یہ بیکار بٹھا رکھنا تو اچھا ہے لیکن کبھی آپ نے اس نتیجہ پر بھی غور کیا کہ اس خانہ نشینی سے ہو گا کیا؟ یہ صاحبزادے کچھ دنوں کے بعد دنیا میں کسی کام کے نہ رہ جائیں گے"۔

کچھ دنوں سے غالباً ان کی مراد اپنی صاحبزادی کی شادی کے بعد سے تھی اور واقعی اگر اس قسم کے خسر کا کوئی شریف آدمی داماد ہو جائے تو وہ یقیناً کسی کام کا نہیں رہ سکتا لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہمارے باپ کا ایسا فرشتہ صفت باپ کسی کا نہ ہو گا، کہنے لگے،

"تو کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس فکر سے خالی الذہن ہوں؟ مجھکو خود ہر وقت یہی فکر ہے کہ کسی طرح اسکو برسر کار کردوں لیکن مناسب موقع کا منتظر ہوں، آجکل بھی ایک آدھ جگہ میری نظر میں ہے لیکن میں غور کر رہا ہوں آخر ایسی جلدی ہی کیا ہے کہ آنکھ بند کر کے اس کو جہنم میں جھونک دوں"۔

واقعی سچ کہا والد صاحب نے کہ نوکری جہنم ہوتی ہے، والد صاحب کے اس جواب سے خالو صاحب کو مات ہو گئی اور ادھر ہمارا بادشاہ غنیم کی فوج میں گھرا ہوا تھا، ادھر خالو صاحب والد صاحب قبلہ سے رخصت ہوئے

اور ہم نے دوسری بازی جمالی۔

خالو صاحب کی اس سازش کا علم ہو جانے کے بعد سچ پوچھئے تو ہم کو اپنی ہونے والی سسرال سے نفرت ہو گئی تھی اور اگر یہ خالو صاحب قبلہ ہمارے رشتہ دار اور اسقدر قریبی رشتہ دار نہ ہوتے تو بجائے نفرت کے ممکن تھا کہ فوجداری ہو جاتی لیکن ہمارے ہونیوالے سالار جنگ بہادر یعنی خالو صاحب کے برسر روزگار بڑے صاحبزادے کا تو یہ حال تھا کہ "بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ" تھے، ان کو لے دے کے دنیا میں بس یہی کام رہ گیا تھا کہ دنیا میں ہماری بیکاری کا ڈھنڈورا پیٹیں اور ہماری آزادی کا رونا روتے پھریں۔

ایک دن ہمارے یہاں صبح تڑکے کوئی دس بجے کے قریب آئے ہم بیدار تو ہو چکے تھے لیکن آنکھیں نہیں کھولی تھیں کہ شاید پھر نیند آ جائے ان حضرت نے آتے ہی طنزاً فرمایا:۔

"کیا ان کے یہاں ابھی صبح نہیں ہوئی"

کسی نے کہہ دیا کہ طبیعت اچھی نہیں، رات دیر سے سوئے تھے آپ فخر سے کہنے لگے:۔

"یہ وقت تو لوگوں کے دفتر جانے کا ہے، دیکھئے میں جا رہا ہوں
قصہ اصل میں یہ ہے کہ جبتک ان کو کسی کام سے نہیں لگایا جائے گا
یہ اسی طرح نوابی کرتے رہیں گے"۔

دل میں تو آیا کہ نوکر سے کہیں کہ نکال دو ان کو، لیکن اپنے
گھر پر آئے ہوئے کیساتھ یہ سلوک کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا لہذا ہم دو تین
کروٹیں ایک آدھ انگڑائی اور دو چار جماہیاں لیکر کلمہ پڑھتے ہوئے
اٹھ بیٹھے، ہم کو اٹھتا ہوا دیکھ کر یہ حضرت پھر زہر آلود ہنسی ہنسے اور فرمایا:۔

"کہئے حضرت مزاج تو بخیر ہے، اب تک آپ پڑے ہی ہوئے ہیں"۔

ہم نے سلام کرتے ہوئے اور آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"ذرا طبیعت کچھ مضمحل سی تھی"۔

بجائے افسوس کرنے کے انھوں نے پھر دل میں چٹکی لی۔

"طبیعت وبیعت کچھ بھی مضمحل نہ تھی، یہ کہئے کہ بیکاری کی یہ
سب باتیں ہیں"۔

ہم نے کچھ غصہ پی کر کچھ اپنے چہرے پر ظاہر کر کے کہا:۔

"اگر آپ لوگوں کو کسی کی بیماری کا بھی احساس نہیں ہوتا تو خیر

جانے دیجئے میں نے آپ سے ہمدردی کا مطالبہ نہیں کیا تھا، خود آپ نے پوچھا تو عرض کر دیا لیکن اب آپ وہی طعن و تشنیع صرف فرما رہے ہیں جن کو آپ نے خدا جانے کیوں اپنا مشن سمجھ رکھا ہے"۔

اس ڈانٹ سے ہمارے عالی مرتبت سالار جنگ کے چہرہ کا رنگ اُڑ گیا اور وہ کچھ کھسیانے ہو کر بولے:۔

"معاف کیجئے گا، میں نے تو یہ محض اسلئے کہا تھا کہ میں نوجوانوں کی اس بیکاری کو اُن کے حق میں زہر سمجھتا ہوں اور میری اب بھی یہی رائے ہے کہ آپ کا موجودہ تساہل جس کو آپ صحت کی خرابی کہتے ہیں صرف اسی بے روزگاری کی بدولت ہے اگر آج آپ برسر روزگار ہوتے تو یہ معمولی شکایتیں آپ کو محسوس بھی نہ ہوتیں لیکن آپ کو اس قسم کے الفاظ سے تکلیف ہوتی ہے تو آئندہ یہ گستاخی نہ ہو گی"۔

یہ کہہ کر وہ حضرت تو سنسناتے ہوئے چلے گئے لیکن ہم کو ایک قسم کا اطمینان سا تھا کہ آج ہم نے ان کے مزاج پوچھ لئے ہیں اب ذرا یہ ہمارے خلاف پروپیگنڈا کرنے میں احتیاط برتیں گے لیکن ہمارا قیاس غلط ثابت ہوا، پہلے تو یہ حضرت ہماری مخالفت کرتے ہوئے بھی یہ

سمجھتے تھے کہ ہم اُن کے نازک ترین عزیز قریب ہونیوالے ہیں جسکے
بعد ان کے گھر بھر کی چوٹی ہمارے گھر بھر کی ایڑی کے نیچے ہو جائیگی،
مگر اب وہ "آستین میں دشنہ پنہاں" کے بجائے "ہاتھ میں خنجر کھلا"
بن گئے تھے، اب اس کا علم ہم کو اس طرح ہوا کہ ہم تو اپنے کمرے میں
برج کھیل رہے تھے اور یہ ہمارے دشمن برابر والے کمرے میں ہمارے
خلاف زہر اُگل رہے تھے۔ یکایک ماموں جان کی آواز آئی۔

"ہاں بیٹا اگر یہی رفتار ہے تو بھیک مانگے بھی نہ ملے گی"۔

ہم سمجھ گئے کہ یہ قصیدہ ہماری ہی شان میں ہے اس لئے کہ
ماموں جان صاحب ہمارے اُن بزرگوں میں تھے جن کا مقصد زندگی
صرف یہ تھا کہ ہم کو رسوا کریں اور ہماری تذلیل سے خوش ہوں، دوسری
آواز ہمارے ہونے والے برادر نسبتی صاحب کی تھی۔

"ماموں جان بات یہ ہے کہ خالو ابا کے لاڈ نے اس کو اور بھی
لاٹ صاحب بنا دیا ہے، بارہ بجے تو صاحبزادے سو کر اُٹھتے ہیں پھر
فیشن ایبل اس قدر ہیں کہ دن رات کنگھی چوٹی اور بناؤ سنگار سے فرصت
ہی نہیں ملتی، آوارہ اور مفت خورا احباب کی صحبت ہے، تاش

شطرنج گنجفہ وغیرہ سے دلچسپی ہے اور پھر مزاج پایا ہے بادشاہوں کا
بھلا ان سے کیا کوئی کام ہوگا، بس سمجھئے کہ اب یہ رہے یونہی"۔

ہمارے ماموں نے سانپ کی طرح پھنکار کر کہا،۔

"وہ تو بس تمام زندگی ہوم ممبری کرتا رہے گا"۔

سالے صاحب قبلہ بہت خوش ہوئے، ٹھٹھا مار کر بولے:۔

"ہوم ممبر بھی آپ نے خوب کہا واقعی وہ ہوم ممبر ہی ہے"۔
حالانکہ اگر ہم ہوم ممبر ہوتے تو یہ لوگ جیل کے باہر نکل ہی نہ سکتے
مگر دیکھئے تو ظالم نے کیا نام تجویز کیا ہے۔ ہم غصّہ میں اپنی بوٹیاں خود ہی
نوچ رہے تھے کہ پھر ماموں صاحب نے گل افشانی کی:۔
"باپ کی زندگی تک مفت کی روٹیاں توڑ لیں لیکن اس کے
بعد کیا ہوگا؟"

سالے صاحب بہادر بولے:۔
"دیکھ لیجئے گا کہ یہ تمام اکڑ دُم کے راستہ نکل جائے گی"۔
ہم غصّہ سے ناچ کر اُٹھے اور پھر جوش میں بیٹھ گئے خیریت
یہ ہوئی کہ پھر ہمارے کان میں کوئی آواز نہ آئی ورنہ ہم ممکن تھا کہ کوئی

سعادت مندی کرتے۔ لیکن اس دن سے جس کو دیکھئے ہم کو ہوم ممبر ہی کہتا تھا اور بعض وقت تو خود والد صاحب بھی ہنس کر ہوم ممبر ہی کہہ دیا کرتے تھے لیکن وہ تھے سنجیدہ اور وضعدار بزرگ انھوں نے بھی ہماری ہوم ممبری میں فرق نہ آنے دیا' ہماری تمام آرائشیں دن دونی اور رات چوگنی ترقی کے ساتھ جاری تھیں' جلنے والے جلتے تھے اور ہم اُن کو جلا کر خوش ہوتے تھے۔ ہمارا ٹینس لان لہلہا رہا تھا' ہماری شطرنج کی بازی جمی ہوئی تھی' ہمارا سینما کا پروگرام بدستور جاری تھا۔ ہمارا آدھی رات کو سونا اور آدھے دن چڑھے بیدار ہونا باقاعدگی کے ساتھ چلا جاتا تھا۔ ہمارا جیب خرچ والد صاحب کی تنخواہ میں ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی پر تھا اور گو تمام دنیا اب ہم کو ہوم ممبر کہتی تھی لیکن ہم تمام دُنیا کی اس مخالفت کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں کرتے تھے' اس لئے کہ ہمارا چاہنے والا باپ ہمارا طرفدار تھا۔

ہم بیوی والے بھی ہوئے اور بچے والے بھی لیکن ہماری ہوم ممبری میں ہمیشہ توسیع ہوتی رہی' باپ کمایا کئے اور ہم بیٹھے بیٹھے

مزے سے اُڑایا کئے، لیکن وہ وقت بھی آگیا کہ والد صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہہ کر ہم کو ہوم ممبری کے عہدہ سے سبکدوش کر دیا اور واقعی ہمارا تمام نشہ ایسا ہرن ہوا کہ دراصل ہم تو کچھ چوندھیا سے گئے۔

اب وہی ہم ہیں کہ کرایہ کے تانگے کے ٹٹو کی طرح دن رات جُتے رہتے ہیں اور اس وقت بھی ٹھنڈی سانس بھر کر یہی شعر پڑھ رہے ہیں ؂

یاد آرہا ہے مجھ کو گذرا ہوا زمانہ
وہ ڈالیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ

مغلوب الغضب

ہماری اپنے متعلق تو ذاتی رائے یہ ہے کہ ہم نہایت نیک واقع ہوئے ہیں لیکن جب دوسرے ہماری سیرت پر ریویو کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم چار عناصر سے مرکب نہیں ہیں، بلکہ صرف آگ سے بنائے گئے ہیں اور انسان کیا ہیں اچھے خاصے انگارہ ہیں، چنانچہ والدہ تو یہ کہتی ہیں کہ بچپن ہی سے ہم چڑچڑے واقع ہوئے ہیں اور اپنے والد کا نمونہ ہیں، والد صاحب کا خیال ہے کہ ہماری ناک پر مکھی نہیں بیٹھتی تھی اور بالکل اس معاملہ میں والدہ کی نقل مطابق اصل ہیں، لیکن بیگم صاحبہ کی رائے ہے کہ گویا وہ ہمارے ساتھ نباہ کر کے جنت میں گھر بنا رہی ہیں۔ مختصر یہ کہ ہم مسلم الثبوت مغلوب الغضب ہیں اور والد صاحب قبلہ اور والدہ صاحبہ مدظلہا کے تبصروں کو یکجا کر دیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس معاملہ میں ہم نجیب الطرفین بھی ہیں۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ خود ہم کو اپنے

اس عیب کا اندازہ نہیں ہوا اور اب تک ہمارا دل یہی کہتا ہے کہ ہمارے متعلق رائے زنی کرنے میں ان عزیزوں نے یقیناً تعصب سے کام لیا ہے اور رائی کو پربت بنا کر پیش کیا ہے۔ ہم کو اس سے انکار نہیں کہ ہم ذرا تند مزاج واقع ہوئے ہیں لیکن کیوں واقع ہوئے ہیں؟ اس پر آج تک کسی نے ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا، ورنہ ہماری یہی تند مزاجی ہماری خوبیوں میں سمجھی جاتی۔

قصّہ اصل میں یہ ہے کہ ہمارے دل میں کبھی کوئی بات نہیں رہتی جو بات ناگوار ہوئی اس پر فی البدیہہ غصہ کر دیا اور ختم، یہ نہیں کہ اس کو نگل گئے اور دل میں رکھ کر پرورش کرنا شروع کر دی یہاں تک کہ وہ بڑھتے بڑھتے بات کا بتنگڑ بن گئی اور پھر اس کے خوفناک نتائج پیدا ہوئے۔ ہم کو بھلا اس کھیتی باڑی کی کہاں فرصت؟ یہاں تو حال یہ ہے کہ اچھے خاصے بیٹھے ہوئے ہیں کوئی بات مزاج کے خلاف ہو گئی بس معلوم ہوا کہ آتش بازی کے قلعہ میں دیا سلائی دکھا دی گئی اور اُس نے اپنی تمام ہنگامہ آرائی پورے زور و شور کے ساتھ شروع کر دی لیکن جب وہ آخری "فش" کے ساتھ بجھا تو یہ معلوم ہوتا ہے

کہ گویا کچھ تھا ہی نہیں اس کو اس طرح سمجھئے کہ ہم کو غصہ ہمیشہ اسی طرح
آتا ہے کہ جیسے کسی ٹین کے پیپہ میں بہت سے پتھر بھرنے کے بعد
اس کو کسی زینہ پر لڑھکا دیا جائے جب وہ ایک قیامت خیز کھڑکھڑاہٹ
کے ساتھ ہر سیڑھی پر ہنگامہ برپا کرتا ہوا اور تمام دنیا کو سر پر اُٹھاتا ہوا
نیچے گرے گا تو نہ وہ شور ہوگا اور نہ وہ ہنگامہ بلکہ فضائیں پُرسکون ہونگی
اور اس برپا ہو کر گزر جانے والے طوفان کے بعد بس سکون ہی سکون
نظر آئے گا لیکن اگر ہم نے اس وقتی طوفان کے بجائے نہایت اطمینان
کے ساتھ اس بات کو دل میں رکھ کر طوفان بپا کرنے کی تیاریاں شروع
کر دی ہوتیں تو ہم سچ کہتے ہیں کہ یہ سکون کبھی میسر نہ آتا۔

غصہ کے متعلق ہم خود جانتے ہیں کہ یہ ایک شیطانی جوش ہے،
اور انسان کے لئے ایک بہت بڑا عیب ہے لیکن ہم غصہ کی اس قسم کو
زیادہ بُرا سمجھتے ہیں جس کا نام حلم یعنی گُھنا پن ہے اور خدا کا ہزار ہزار شکر
ہے کہ ہم اس عیب سے پاک ہیں اور ہمارا دل ہمیشہ ان ناگواریوں کے اثرات
سے پاک رہتا ہے، بات یہ ہے کہ ہم کو جو بات بھی ناگوار ہوتی ہے اس کا
اثر دل تک جانے سے پہلے ہی غصہ کی شکل اختیار کر کے آتشبازی

بن جاتا ہے جو فوراً ابھر ابھر چھوٹنا شروع کر دیتی ہے اور اسوقت تک چھوٹتی رہتی ہے جب تک غصہ کی بارود باقی رہتی ہے اس کے بعد طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے دل پر کوئی بار نہیں ہوتا اور بالکل یہی معلوم ہوتا ہے کہ اولے برسا کر ابر نکل گیا اور نیلا آسمان جگمگاتے ہوئے سورج یا اگر رات کا وقت ہو تو روشن تاروں کے ساتھ نکل آیا، اب آپ ہی بتائیے کہ یہ غصہ اچھا یا وہ ضبط کہ دل کے گودام میں تمام ناگواریاں تمام تلخیاں اور تمام کدورتیں بھری جارہی ہیں گویا یہی مرتے وقت اولاد کیلئے چھوڑ جائینگے ۔

ہمارا غصہ اس گھُنے پن سے بہتر سہی جس کو ہم بدترین عیب سمجھتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ہے یہ بھی ایک عیب، اگر یہ عیب بھی ہم میں نہ ہوتا تو زیادہ بہتر تھا لیکن بجائے اس کے کہ ہم یہ کہیں کہ ہم میں یہ عیب بھی نہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔ ہم کو یہ کہنا چاہیئے کہ ہم فرشتہ ہوتے تو اچھا تھا اس لئے کہ ہمارے نزدیک غصہ فطرت انسانی ہے اور یہ طے ہے کہ ہم انسان ہیں ہم کو تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ ہم کو جو غصہ ملا ہے وہ قطعاً بے ضرر اور محض نمائشی ہوتا ہے اور اگر اسکو خاموشی کے ساتھ ٹال دیا جائے تو اس سے زیادہ مہمل دنیا میں اور کوئی چیز ہوتی

ہی نہیں، ہم خود ہی تھوڑی دیر تک چیخیں گے، ناچیں گے، کودیں گے اور خود ہی ٹھیک بھی ہو جائیں گے لیکن اگر اس آگ کو مشتعل کیا جائے تو یہ جہنم تک ترقی کر سکتی ہے اور خواہ ہم کو بعد میں پشیمان ہونا پڑے لیکن اس وقت ہم سب کچھ کر سکیں گے۔ ہم نے بارہا اپنے غصہ کے بعد صحیح الدماغ ہو کر اپنے غصہ پر تنقیدی نظر ڈالی ہے تو ہم صرف اسی نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ہمارا غصہ بھی ایک قسم کا آسیبی خلل ہوتا ہے یا اس کو جنون کا دورہ کہیئے، بہر حال اس وقت ہم مرفوع القلم ہوتے ہیں اور واللہ اگر ہم اپنے آپے میں ہوتے تو غصہ کو اس نامعقول حد تک کبھی نہ بڑھنے دیا کرتے کہ ہم پر پاگل خانہ سے زنجیر توڑ کر بھاگ نکلنے والے پاگل کا شبہ ہوتا اور ہم کو لوگ مرکھنے بیل کی طرح خطرناک سمجھتے لیکن کیا کریں اس وقت تو ہم خدا جانے کیا ہو جاتے ہیں اور خدا جانے ہماری یہ معقولیت جو [illegible] میں اس وقت موجود ہے کدھر تشریف لیجاتی ہے ہم نے لاکھ لاکھ چاہا کہ یہ غیر شریفانہ حرکت چھوڑ دیں اور اس درندگی سے باز آجائیں لیکن ہر مرتبہ یہی نتیجہ نکلا کہ یہ بات ہمارے بس کی نہیں ہے خدا ہی چھڑائے تو چھوٹے گی، ہماری کوشش سے کچھ نہیں ہو سکتا۔

آپ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ آخر غصہ آتا ہی کیوں ہے جو اس قدر خطرناک ہو جائے؟ لیکن ہم آپ سے عرض کریں گے کہ یہ سوال بجائے اس کے کہ آپ ہم سے کریں ہمارے غصہ سے کیجئے اگر ہم اس کو بُلاتے ہوتے تو یقیناً اس سوال کا جواب ہم ہی پر واجب الادا تھا لیکن جب وہ بغیر بلائے خود بخود آموجود ہوتا ہے تو بتائیے ہم اس کا کیا جواب دے سکتے ہیں سوائے اس کے کہ وہ خود بخود آجاتا ہے بیگم صاحبہ کی رائے اس معاملہ میں سب سے زیادہ معتبر بھی ہے اور مناسب بھی، وہ یہ کہتی ہیں کہ تم پر کچھ دَورہ سا پڑتا ہے اور ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ غصہ ہم کو عادتاً یا فطرتاً نہیں آتا بلکہ بطور مرض کے آتا ہے جس کے لئے دعا فرمائیے کہ خداوند کریم ہم کو صحت کلی عطا فرمائے اور اس موذی مرض سے نجات دے جو ہمارے لئے خطرناک ہونے سے زیادہ دوسروں کیلئے مہلک ہے۔

غصہ کے متعلق غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ یہ موت کی طرح برحق بھی ہے اور ناگہانی بھی اس کے آنے کے کچھ اسباب و علل نہیں ہوتے بلکہ جب اس کو آنا ہوتا ہے تو موت کی

طرح بہانے ڈھونڈھ کر آتا ہے اور زیادہ تر خواہ مخواہ ہوا کرتا ہے خود ہم نے غصہ کے بعد اکثر غصہ کی وجہ پر غور کیا ہے تو معلوم ہوا ہے کہ کچھ بھی نہیں یوں ہی آگیا تھا اور پھر جو پشیمانی ہوتی ہے وہ ایک خاص قسم کی کمزوری اور بزدلی پیدا کر دیا کرتی ہے جس کا نام مہذب الفاظ میں انفعال رکھا گیا ہے، چنانچہ اسی انفعال کی بدولت بارہا تو ہم کو بیگم صاحبہ کے آگے ناک رگڑنی پڑی ہے اور سیکڑوں مرتبہ نہ معلوم اپنے سے کتنے کمزور آدمیوں کے آگے ہاتھ جوڑنا پڑے ہیں، بزرگوں کے تو خیر ہم خورد ہی ہیں، ان سے معذرت خواہ ہونا تو گویا عین سعادت ہے لیکن ہمارے اس غصہ کے بعد والے فدویانہ طرز عمل سے سب کو اسی نتیجہ پر پہونچنا چاہیئے کہ اگر ہم وقتی طور پر غصہ سے مجبور ہو کر انسانیت سے گزر جاتے ہیں اور نامعقول ہو کر رہ جاتے ہیں تو اس کے بعد فوراً ہی اپنی اصلی معقولیت پر آجاتے ہیں، یہ نہیں کہ بس نامعقول ہوئے تو ہو کر رہ گئے۔

مگر ایمان کی بات تو یہ ہے کہ غصہ ہمارا بدترین عیب سہی بلکہ اس کو دنیا کا سب سے بڑا گناہ بھی فرض کر لیجئے لیکن اس کی بہت کچھ

ذمہ داری اس شخص پر بھی ہوتی ہے جس پر ہم کو غصہ آئے تالی ہمیشہ
دونوں ہاتھوں سے بجا کرتی ہے۔ ہم اپنے غصہ کے تنہا مجرم تو اس
حالت میں ہو سکتے ہیں کہ تنہا بیٹھے ہوئے در و دیوار پر غصہ کر رہے ہوں
اپنی بوٹیاں خود ہی نوچ رہے ہوں اور ہوا سے لڑ رہے ہوں لیکن
یہ پاگل پن آج تک ہم سے نہیں ہوا، البتہ جب کوئی غصہ کی بات
کرتا ہے تو بیشک ہم آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور اسوقت خود ہم کو
اپنا ہوش نہیں ہوتا، مگر سوال یہ ہے کہ آخر ہم کو مشتعل ہی کیوں کیا جائے
جو ہم کو غصّہ آئے اور اگر غصہ کی بات کر کے ہم کو غصہ کی دعوت
دی گئی ہے تو پھر ہمارے مغلوب الغضب ہونے کی شکائیت نہ ہونا چاہیئے۔

ایک دن یہی ذکر بیگم صاحبہ سے ہو رہا تھا کہ آخر تم نے ہم کو
اسقدر کیوں بدمزاج مشہور کر دیا ہے؟

کہنے لگیں کہ "آپ واقعی بہت بدمزاج ہیں، خدا بچائے آپکے
غصّہ سے"۔

ہم نے ہنس کر کہا "اور لوگ بھی تو آخر غصّہ کرتے ہیں مگر آپ
لوگ صرف ہم ہی کو کیوں نکّو بنائے ہوئے ہیں"؟

بولیں۔" خدا نہ کرے کوئی آپ کی طرح غصہ کرے جب وقت آپ کو غصہ آتا ہے معلوم یہ ہوتا ہے کہ قیامت آگئی یا خدانخواستہ آپ کے دشمنوں کا دماغ اُلٹ گیا۔"

ہم نے پھر متبسم ہو کر کہا۔" بیگم سنو۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ غصہ کے سلسلہ میں ہم بدنام بہت کئے گئے ہیں خود ہمارے گھر والوں ہی نے ہم کو تمام دنیا میں رسوا کیا ہے ورنہ غصہ کس کے مزاج میں نہیں ہوتا۔"

کہنے لگیں۔" کہ آپ میں اگر غصہ نہ ہوتا تو کسی کی مجال نہیں تھی کہ آپ کو کوئی بدنام کر دیتا۔"

ہم نے کہا کہ۔" فرض کر لو کہ ہم میں غصہ ہے لیکن اگر ہمارا غصہ تمام دنیا میں اُچھالا نہ جاتا تو آج ہم اسقدر بدنام نہ ہوتے، کیا ہمارے گھر والوں کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ ہمارے عیب پر پردہ ڈالیں"۔

کہنے لگیں۔" یہ تو ٹھیک ہے مگر آپ اپنے غصہ کو خود ہی کب چھپنے دیتے ہیں، آپ تو خود ہی وہ قیامت برپا کرتے ہیں کہ دنیا والے تو دنیا والے میرے خیال میں قبر کے مُردے بھی ڈر کے مارے دہل جاتے ہوں گے۔"

ہم نے ذرا خفیف ہو کر کہا "یہ تو خیر سب کہنے کی باتیں ہیں ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اگر اسی طرح سب کو بدنام کیا جائے جس طرح ہم کو ہمارے گھر والوں نے بدنام کیا ہے تو شاید آج کوئی بھی خوش مزاج، حلیم الطبع اور نیک مرد اس دنیا کے پردے پر نہ ملے"۔

کہنے لگیں۔ "آخر نسیم صاحب بھی تو ہیں، امین صاحب بھی تو ہیں، پھوپا میاں بھی تو ہیں، میں نے تو کبھی کسی کا غصہ نہیں سنا"۔

ہم نے جل کر کہا۔ "بس مجھ کو یہ تقابل ہی تو برا معلوم ہوتا ہے آپ کو تو تمام دنیا نیک نظر آتی ہے، اگر کسی میں تمام دنیا کے عیب ہیں، کوئی سب سے زیادہ برا ہے جس میں کیڑے پڑے ہوئے ہیں وہ میں ہوں۔ آپ ہی نے تو مجھ کو اس طرح بدنام کیا ہے، جب اپنی بیوی، اپنی شریک رنج و غم اپنی رفیقۂ حیات ہی دشمن ہو جائے تو کسی اور کا کیا گلہ"؟

کہنے لگیں۔ "بس آپ کو تو غصہ آ گیا"۔

ہم نے کڑک کر کہا۔ "اس کا نام غصہ ہے؟ یہ غصہ ہے؟؟

اس کو غصہ کہتے ہیں"؟؟؟

ڈر کر کہنے لگیں۔ "یہ اور کیا ہے"؟

اب ہمارے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے، منہ سے گھوڑے کی طرح جھاگ نکل رہا تھا، کہنا چاہتے تھے کچھ اور منہ سے نکلتا تھا کچھ۔

ہم نے حلق پھاڑ کر کہا۔ "آپ، آپ، آپ، تم، تم، تم ہی نے مجھ کو تمام دنیا میں، تمام خاندان میں بدنام کیا ہے، اگر تم بدنام نہ کرتیں تو کسی کی کیا مجال تھی جو ایک حرف بھی مجھ کو کہتا"۔

وہ تو خیر چپ ہو کر بیٹھ رہیں لیکن ہم کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ گویا تمام جسم میں آگ لگی ہوئی ہے مگر ہاتھ پیر ٹھنڈے تھے اور دل چاہتا تھا کہ آج یا تو ہم ہی رہ جائیں یا یہ افلاطون کی خالہ بیگم صاحبہ ہی رہیں۔

ہم نے تھوڑی دیر تک خاموش آگ میں جل کر کہا:۔

گھر میں بغاوت، گھر میں دشمنی، اپنے دشمن، اپنی بیوی اپنے خون کی پیاسی، اپنی رفیقۂ حیات، اپنی مونس و غمگسار اپنی ——— اپنی بیوی ہو کر یہ عداوت لعنت ہے اس زندگی پر"۔

ہم اسی طرح ہنکار رہے تھے کہ باہر سے کسی نے پکارا "شوکت" ہم نے کڑک کر جواب دیا "کون ہے"؟

جواب آیا۔" ادھر آئیے لاٹ صاحب"۔

ہم اس بدتمیزی پر ایک دم جلبلا ہی تو گئے اور برق بلا کی طرح دروازے پر پہونچے، نسیم صاحب کھڑے مسکرا رہے تھے۔

ہم نے جاتے ہی کہا۔" یہ تہذیب سے گری ہوئی بات ہے"۔

کہنے لگے۔" تہذیب مہذب آدمیوں کے ساتھ برتی جاتی ہے"۔

ہم نے کہا۔" میں معافی چاہتا ہوں میں اس بے تکلفی کے لئے تیار نہیں ہوں"۔

یہ کہہ کر الٹے پیر دروازہ سے واپس آرہے تھے کہ تیزی میں چارپائی کے پایہ سے ٹکرا گئے، معلوم ہوا کہ بھڑکتی ہوئی آگ پر کسی نے پٹرول چھڑک دیا، چارپائی کی شامت آگئی اور تھوڑی ہی دیر میں تین چار دھماکوں کے بعد چارپائی کا ہر حصہ علیحدہ علیحدہ پڑا ہوا تھا اور ہم غصہ کے مارے کانپ رہے تھے لیکن گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا معلوم ہوتا تھا کہ سب کو سانپ سونگھ گیا ہے۔

دوپہر سے شام تک یہی عالم رہا لیکن شام کو معلوم یہ ہوتا تھا کہ کچھ ہوا ہی نہیں ہے اور گویا ہم نے غصہ کیا ہی نہیں تھا لیکن ہم نے

مولوی اسمٰعیل کی کسی ریڈر میں یہ پڑھا تھا کہ:۔

"غصّہ کا بالکل دور ہو جانا بھی ایک دم سے مناسب نہیں ہے اس سے بُزدلی پیدا ہو جاتی ہے"۔

لیکن بُزدلی تو پیدا ہی ہو گی، خواہ غصہ کتنی ہی دیر میں کیوں نہ ختم ہو، چنانچہ رات کو بیگم صاحبہ تو پھولی ہوئی تھیں اور ہم جو کچھ کہہ رہے تھے اور جس طرح فدوی بنے ہوئے تھے اسکی تفصیل اب نہ پوچھئے۔

بہر حال اب یہ ثابت ہو گیا کہ ہم غصہ کے معاملہ میں سوڈا واٹر کی بوتل واقع ہوئے ہیں اور ان لوگوں سے بخدا اچھے ہیں جو دل میں بات رکھ کر پشت در پشت بدلہ لیتے ہیں۔

الہ آباد کے امرود

کسی دوست کا اپنے کسی جگری دوست کے لئے باہر سے کوئی
تحفہ لانا غیر معمولی بات نہیں ہے بلکہ دوستی اسی کا نام ہے کہ اس قسم کے
دوستانہ مراسم ادا ہوتے رہیں لیکن خدا گواہ ہے کہ جس وقت نمائش میں
مبین ہم سے ملے اور انھوں نے یہ مژدہ سُنایا کہ وہ الہ آباد گئے تھے
اور ہمارے لئے امرود لائے ہیں تو ہم پر تھوڑی دیر کے لئے کچھ ایسی
کیفیت گزر گئی کہ گویا ہم کو ہندوستان ایسے کسی ملک کی سلطنت مل
گئی ہے، تھوڑی دیر تک تو ہم ایک عالم حیرت میں خاموش کھڑے رہے
اس کے بعد ہم نے دل ہی دل میں مبین کی شرافت کا اعتراف کرتے
ہوئے اپنے اس دیرینہ خیال پر اظہار افسوس کیا کہ مبین انتہائی خود غرض
ابن الوقت اور ایسا کنجوس انسان ہے کہ اگر صبح اُٹھ کر اس کا نام لے لیا
جائے تو دن بھر کھانے کو نہ ملے، آخر ہم نے اپنی آنکھوں میں تشکر کی چمک

پیدا کر کے مبین سے کہا:۔

"الہ آباد کے امرودوں سے زیادہ تمہارا یہ خلوص کہ تم میرے لئے امرود لائے قابل قدر ہے"۔

مبین نے کسر نفسی سے جواب دیا:۔

"لاحول ولا قوۃ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے، میں تو اپنے گھر کے لئے کچھ امرود لایا تھا لہٰذا تمہارے یہاں بھی بچوں کے لئے بھیجدئے ہیں البتہ اس کا خیال رکھنا کہ وہ چھ قسم کے مختلف ہیں، ان میں سے بعض تو یونہی کھانے کے ہیں بعض کچالو کے لئے مخصوص ہوتے ہیں اور بعض کی جیلی اچھی ہوگی"۔

ہم نے اپنی واقفیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا:۔

"وہ تو میں سب پہچان لوں گا مگر تم نے آخر اسقدر تکلیف کیوں کی اگر امرود لانا ہی تھے تو بس ایک آدھ قسم کے لے آئے ہوتے تم نے گویا میرے گھر میں امرودوں کی اچھی خاصی دوکان بھیجدی ہے"۔

"مبین نے پھر تکلف سے کہا:۔

"ارے نہیں جی وہ تو بس بچوں کے لئے بھیجے ہیں"۔

میں اس وقت دراصل شکر گزاری کے مارے مرا جارہا تھا اور میرا دل چاہتا تھا کہ مبین کی اس سچی دوستی پر قربان ہو جاؤں، اسی کے ساتھ مجھ کو افسوس بھی ہو رہا تھا کہ اب تک میں نے مبین کے متعلق اس قدر غلط رائے کیوں قائم کی تھی وہ ہیرا تھا مگر میں نے اس کو ہمیشہ پتھر سمجھا، وہ موتی تھا مگر میں اس کو کنکر جانتا رہا، میں اسوقت مبین کی اس محبت سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ غیر ارادی طور پر دوستی اور خلوص کے اس فرشتہ کی پرستش کو دل چاہتا تھا۔ میں نے مبین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر محبت سے دبایا اور اس کو تقریباً گلے لگا کر کہا:۔

"اچھا مبین یہ تو بتاؤ کہ تم نے کبھی اس بےحد و پایاں خلوص کا بھی صحیح اندازہ کیا ہے جو مجھ کو تمہارے ساتھ ہے"؟

مبین نے مسکراتے ہوئے کہا:۔

کیا اس قدر خلوص کے بعد بھی اندازہ کرنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے"؟

سچ پوچھئے تو مبین کے اس جامع جواب میں محبت اور خلوص کی ایک دنیا سمٹ کر سما گئی تھی اور واقعہ بھی یہی ہے کہ میں نے تو خیر

آج ہی مبین کے عشق فریب خلوص کا اندازہ کیا تھا مگر وہ ہمیشہ سے صحیح معنوں میں میرا دوست تھا، ورنہ ظاہر ہے کہ الہ آباد سے خاص طور پر میرے لئے امرود لانا بغیر اس خصوصیت کے ممکن نہ تھا، میں نے مبین کے نورانی چہرہ پر غور سے نظر ڈالی اور اس کے پُر خلوص دل کی گہرائیوں تک اپنے تخیلات کو پہنچا کر خود بخود جھوم گیا، مجھ کو اس وقت یہ محسوس ہو رہا تھا کہ گویا مبین کا خلوص مجھ کو اس دنیا سے اُڑا کر کسی ایسے عالم میں پہونچا آیا ہے جہاں سوائے خلوص اور محبت کے کچھ اور نہیں ہے۔ میں مبین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا مگر قاصر تھا، میں خوبصورتی کے ساتھ مبین کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ آج سے میں اس کا ایک ادنیٰ خادم ہوں مگر مجھ کو الفاظ نہ ملتے تھے، میں مبین کے اس محبت آمیز سلوک کا جواب دینا چاہتا تھا مگر توبہ کیجئے اسوقت مجھ سے یہ بھی ممکن نہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ مبین کو اٹھا کر آنکھوں میں بٹھالوں اور پھر دل میں رکھ لوں مگر یہ بھی نہ ہو سکتا تھا آخر میں نے اپنے کو بہ مشکل تمام اس روحانیت سے علحدہ کر کے مادی طور پر مبین سے کہا :-

"کل صبح کھانا میرے ہی ساتھ کھانا۔"

مبین راضی ہو گیا، اس لئے کہ وہ سچا دوست تھا اور سچی دوستی
میں تکلفات کی گنجائش نہیں ہوتی لیکن میں دراصل تکلف برتنا چاہتا تھا
اور جب مبین نے میری دعوت قبول کر لی تو میں نے بھی طے کر لیا کہ یہ
دعوت صحیح معنوں میں مبین ایسے پُر خلوص دوست کے شایان شان
ہونا چاہیئے اس موقع پر چند اپنے اور چند مبین کے احباب کو مدعو کرنا
بھی ضروری تھا لہذا گھر جانے سے پہلے ہی میں نے مناسب سمجھا کہ
چودھری صاحب، مرزا صاحب، مسعود صاحب اور محمود صاحب کو بھی
دعوت کی اطلاع دیدوں تاکہ مبین کی دلچسپی کے تمام سامان موجود رہیں
لیکن مبین کے لائے ہوئے امرودوں کا صرف یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ
یہ چار چھ آدمی دعوت میں آکر ان چھ اقسام کے مختلف امرودوں کو وصول
کر لیں اس لئے کہ چھ اقسام کے یہ مختلف امرود یہ گنتی کے چند آدمی نہیں
کھا سکتے تھے لہذا میں نے یہ طے کیا کہ کچھ امرود تو اس دعوت میں صرف
ہو جائیں گے باقی اس طرح تقسیم کر دیئے جائیں گے کہ تھوڑی سی جیلی اور کچھ
امرود تو ڈپٹی صاحب کے یہاں بھیجدیئے جائیں گے اور تھوڑے امرود
پنڈت جی کے یہاں بھیجدیں گے اس لئے کہ وہ بیچارے بھی ہمیشہ کرم

فرماتے رہتے ہیں، ہولی، دیوالی، کوئی تہوار ہو ان کے یہاں سے حصّہ ضرور آتا ہے۔ کچھ اچھے پھل چھانٹ کر صاحب کے یہاں بھیجدیں گے وہ بھی خوش ہو جائیں گے باقی سسرال بھیجدیں گے تاکہ بیگم صاحبہ کے گھر والے بھی تو دیکھیں کہ ہمارے کیسے کیسے دوست ہیں۔

ہم اسی پروگرام کی ترتیب میں محو چلے جا رہے تھے کہ سُسرال کے عین پھاٹک پر ہمارے سالار جنگ بہادر نے "سلام علیکم دولھا بھائی" کہہ کر گرفتار کر لیا اور اب ہم کو مجبوراً گھر میں بھی جانا پڑا، ورنہ یہی کہا جاتا کہ اس طرف سے گزرتے ہیں تو بھی گھر میں نہیں آتے۔

گھر میں اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ہم نے اپنی تمام سالیوں کو نیوتہ دیا کہ کل اعلیٰ درجہ کے الہ آبادی امرود کھلائیں گے، سب نے پوچھا بھی کہ کہاں ہاتھ مارا مگر ہم نے یہی کہہ کر ٹال دیا کہ سیٹھ جی نے الہ آباد میں امرودوں کا ایک باغ خریدا ہے اس باغ کی پہلی فصل ہمارے یہاں بھیجدی ہے اس میں سے یہاں بھی بھیجے جائیں گے۔

اس وعدہ کے بعد ہم نے بمشکل تمام اجازت حاصل کی، اور سسرال سے روانہ ہو کر چودھری صاحب کے یہاں جا رہے تھے کہ راستہ

میں نسیم مل گئے اور ان کو دیکھتے ہی ہم کو یاد آیا کہ کل دعوت میں ہم کو چاہیے کہ ان کو بھی مدعو کریں لہذا ان سے بھی کہہ دیا کہ بھائی کل صبح ہمارے ہی ساتھ کھانا کھانا، انھوں نے اس ہنگامی دعوت کی وجہ پوچھی تو ہم نے کہہ دیا کہ :-

"دعوت تو خیر یونہی ہے اصل میں تم کو الہ آباد کے امرود اور جیلی وغیرہ کھلانا ہے۔ چودھری صاحب بھی ہوں گے اور مرزا صاحب، مسعود، محمود اور مبین بھی ہوں گے، تھوڑی دیر دلچسپی رہے گی"۔

نسیم نے دعوت قبول کر لی اور ہم چودھری صاحب کی طرف لپکے، اسلئے کہ اسی مختصر وقت میں سب صاحبان کو اطلاع بھی دینا تھی اور پھر گھر پہونچکر جو سب سے زیادہ مشکل کام تھا وہ یہ تھا کہ جیلی تیار ہو جائے، اس لئے کہ یہی کمبخت ایک جھگڑے کی چیز ہوتی ہے اور اس کو اسی وقت تیار کر لینا زیادہ اچھا تھا لیکن باوجود اس جلدی کے چودھری صاحب کے یہاں پہونچنے سے قبل ہی صاحب کا خانساماں مل گیا اور ہم نے مناسب سمجھا کہ اس کو اطلاع دیدیں کہ صاحب کیلئے کچھ امرود کل بھیجیں گے، تاکہ وہ اگر جیلی وغیرہ بنانا چاہے تو ابھی سے انتظام کر لے۔ ہم نے خانساماں سے

صرف یہی کہہ دیا کہ ہماری سُسرال کے باغ سے امرود آئے ہیں، وہ کل صاحب کیلئے بھیجیں گے تم خود اُن کو پیش کر دینا اور تمہارے لئے علیحدہ ہوں گے وہ تم رکھ لینا، خانساماں نے اس تحفہ کا صاحب کی طرف سے بالکل صاحب کے انداز سے شکریہ ادا کیا اور ہم اس سے رخصت ہو کر چودھری صاحب کے مکان کی طرف تیزی سے بڑھے۔

چودھری صاحب کے مکان سے پہلے ہی مسعود اور محمود کا مکان پڑتا تھا لہذا ان حضرات کو دعوت کی اطلاع دی اور ان کے یہاں سے چودھری صاحب کے یہاں پہونچے، یہ بھی بالکل اتفاق سمجھئے کہ چودھری صاحب کے یہاں ڈپٹی صاحب بھی آئے ہوئے تھے لہذا ڈپٹی صاحب کی موجودگی میں چودھری صاحب کو مدعو کرنا تو مناسب نہ سمجھا البتہ اُن کے واپس ہونے کے انتظار میں اُسوقت تک وہاں بیٹھنا پڑا جب تک کہ وہ رخصت نہیں ہوئے، ڈپٹی صاحب جب چودھری صاحب کے یہاں سے جانے لگے تو ہمنے اُن سے بھی کہدیا کہ کل کچھ امرود آپکی خدمت میں پیش کروں گا ان کو قبول فرما کر ذرہ نوازی فرمائیے گا اور میرے گھر میں جیلی خاص طور پر بناتی ہیں وہ بھی بھیجوں گا، ڈپٹی صاحب نے کھیسیں نکال کر

بڑی خوشی کے ساتھ اس تحفہ کو قبول فرمانے کا وعدہ فرمایا اور سگار
چباتے ہوئے اپنی ٹم ٹم پر دفعان ہو گئے تو ہم نے چودھری صاحب کو
دعوت دی، چودھری صاحب نے بھی باوجود انتہائی مصروفیت کے
دعوت کو رد نہیں کیا بلکہ اس "مکلف الخدمت" کو ماحضر تناول فرما کر
ممنون فرمانے کا وعدہ کر لیا۔

چودھری صاحب سے رخصت ہو کر ہم الہ آباد کے لطیف امرودوں
کے خوشبو دار اور خوش ذائقہ تخیل میں محو ہو کر گھر کی طرف روانہ ہوئے
اسوقت ہمارا دماغ امرودوں کی "کچا لو طلب" اور "جبلی آور" خیالی خوشبو
سے بسا ہوا تھا اور نظر کے سامنے الہ آباد کا وہی خوبصورت پھل تھا جسکے
متعلق اکبر ایسے مایہ ناز شاعر نے بھی اپنے مخصوص انداز میں کہا ہے ؎

کچھ الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

ظاہر ہے کہ اب تو اکبر رہے نہیں لے دے کے اب تو حاصل
الہ آباد صرف وہی چیز رہ گئی ہے جس کو عرف عام میں امرود کہتے ہیں
اور واقعہ بھی یہی ہے کہ صرف امرود ہی الہ آباد کی ایک ایسی خصوصیت ہے

کہ لکھنؤ نہیں بلکہ ایسے ایسے ہزاروں لکھنؤ اس امرود والے الہ آباد پر قربان کئے جا سکتے ہیں اور صرف اسی خصوصیت کی وجہ سے اس امرودوں کے شہر کو صوبجات متحدہ کا نہیں بلکہ ہندوستان کا پایہ تخت ہونا چاہیئے تھا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ سر ہارکورٹ بٹلر سابق گورنر یو۔پی کو یہ کیا سوجھی تھی کہ وہ اس امرودوں کی جنت کو چھوڑ کر لکھنؤ کو صوبجات متحدہ کا پایہ تخت بنانا چاہتے تھے، معلوم یہ ہوتا ہے کہ امرود ان کو مرغوب نہ تھے ورنہ اس کفران نعمت کی اور کوئی وجہ ہی نہیں ہو سکتی، لیکن امرودوں کی بھی دعا میں کم سے کم اتنا ضرور اثر تھا کہ سر بٹلر کی گورنری ختم ہو گئی اور اسی حسرت میں ختم ہو گئی کہ الہ آباد کے بجائے لکھنؤ صوبجات متحدہ کا پایہ تخت بنجائے لیکن الہ آباد کے امرودوں کے ہوتے ہوئے لکھنؤ کو یہ امتیاز نہ حاصل ہونا تھا نہ ہوا۔ الہ آباد کے امرود ایک طرف رہے اور بٹلر صاحب کی لکھنؤ پرستی ایک طرف اور پھر دیکھ لیجئے کہ کس کو فتح ہوئی، بات اصل میں یہ ہے کہ الہ آباد کے امرود بھی تو قیامت کے ہوتے ہیں جس مکان میں ایک امرود پہنچ جائے بس وہاں خوشبو کی وجہ سے "بوئے الہ آبادمی آید" کا مضمون ہوگا، پھر حُسن کا یہ حال ہے کہ سفید سفید مرمریں امرودوں پر سُرخ

حنائی رنگ کی پتیاں معلوم یہ ہوتا ہے کہ کسی یخ بستہ میدان پر جا بجا
آگ لگی ہوئی ہے یا کسی حسین کو رات بھر مچھروں نے ستایا ہے یا وادیٔ
کشمیر میں جا بجا میخانے کھلے ہوئے ہیں پھر ان کا گداز العظمت للہ
اور ان کے سبز سبز پتے جن کا لطف وہی حضرات سمجھ سکتے ہیں جن کے
گھر میں بکریاں پلی ہوں۔

یہ تو ہوئیں تمام بیرونی خوبیاں، رہ گئیں انکی اندرونی لطافتیں
اس کی تفصیل بیان کرنے کیلئے کاغذ پر زبان سے لکھنا چاہیئے یا پھر
امرود سے مختصر یہ کہ الہ آباد کی قسمت میں جنت کا یہ پھل لکھا ہوا تھا،
جس نے الہ آباد کو دنیا کی جنت بنا دیا ہے ——"

ہم امرودوں کے متعلق انہی خیالات میں محو گھر پہنچے دروازہ
میں قدم رکھتے ہی ہم نے اپنی ناک کے دونوں نتھنے پھڑ پھڑائے
تاکہ اب اس شامہ نواز خوشبو کو حقیقی طور پر بھی سونگھ سکیں جس کو اب تک
محض تخیلات میں سونگھ رہے تھے لیکن امرود کی خوشبو کے بجائے وہی
خوشبو ناک میں سے گزر کر دماغ کے ٹکڑے اڑانے لگی جو ڈیوڑھی میں
بندھی ہوئی بکریوں کی وجہ سے ڈیوڑھی کو محکمہ حفظان صحت کیلئے

ایک غور طلب مسئلہ بنائے ہوئے تھی اسکے علاوہ ہم کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا
کہ ان غریب بکریوں کو ابتک امرود کے خوش ذائقہ پتے نہیں دئے گئے
اگر امرودوں کو ابتک اسلئے صرف نہیں کیا گیا تھا کہ ہم آ کر ان کو دیکھ
لیں تو کیا پتوں کی حفاظت بھی ضروری تھی؟ مگر یہ بھی ٹھیک ہے کہ پتے
توڑ دینے کے بعد امرود پر عجیب قسم کی بیوگی برسنے لگتی ہے لہذا امرود
کے سہاگ کا منظر دکھانے کے لئے ابھی پتے توڑے نہ گئے ہونگے۔
ہم یہی سوچتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوئے اور ہر طرف
گھبرائی ہوئی نظر ڈالی کہ کس طرف امرودوں کا ڈھیر لگا ہے مگر ہم کو
امرود کہیں نظر نہ آئے۔

آخر کار ہم نے بیگم سے پوچھا۔

"امرود۔"

جواب ملا "نعمت خانہ میں ہیں"۔

ہم نے حیرت سے کہا "کیا کہہ رہی ہو؟ میں پوچھتا ہوں وہ
سب امرود کہاں ہیں جو مبین صاحب نے بھیجے ہیں"۔

بیگم نے کہا "کہہ تو رہی ہوں وہ چھ امرود نعمت خانہ میں ہیں"۔

ہم کو بیگم کی اس بیوقوفی پر غصہ آگیا۔

"چھ امرود ؟ یعنی ایک ایک قسم کا ایک ایک امرود نعمت خانہ میں رکھ دیا، اور باقی ؟"

بیگم نے کہا "اور باقی کیسے بس ؟"

ہم نے ٹھنڈے دل سے غور کر کے سمجھ لیا کہ بیچاری بیوقوف عورت غالباً ہمارا مطلب نہیں سمجھی لہذا ہم نے پھر پوچھا:۔

"مبین صاحب کے یہاں سے الہ آباد کے امرود چھ قسم کے آئے ہیں ــــ کہو ہاں ــــ اُن میں کا ایک ایک تو تم نے حفاظت سے نعمت خانہ میں رکھ دیا ــــ کہو ہاں ــــ اب میں یہ پوچھتا ہوں کہ باقی سب کہاں رکھے ہیں ؟"

بیگم نے چیں بجبیں ہو کر کہا:۔

"چلے وہاں سے پاگل بنانے ــــ کہہ تو دیا کہ مبین صاحب کے یہاں سے چھ امرود آئے تھے وہ نعمت خانہ میں رکھے ہیں"۔

ہم نے دانت پیس کر بیگم سے خوشامدانہ لہجہ میں کہا:۔

"چھ نہیں، بلکہ یہ کہو کہ چھ قسم کے امرود آئے تھے"۔

بیگم نے کہا۔ "مجھ کو قسم وسم تو معلوم نہیں، بس چھ امرود آئے تھے وہ سب نعمت خانہ میں ہیں"۔

اب ہمارا دماغ چکرانے لگا اور ہم نے اس سوال کو پھر سے پوچھا۔

"کُل کتنے امرود آئے"؟

بیگم "توبہ ہے ــــ چھ چھ چھ ــــ بار بار کہہ رہی ہوں چھ"۔

ہم۔ "یعنی صرف چھ، یا چھ چھ چھ ــــــ تمہارا کیا مطلب ہے"؟

بیگم نے پھر منھ پھیر کر کہا۔

"اونھ ــــ ہم نہیں جانتے ــــــ واہ"۔

ہم۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ ہر چھ قسم کے چھ چھ یا صرف چھ، بحیثیت مجموعی"؟

بیگم نے کہا۔ "صرف چھ، کُل چھ، بس چھ"۔

اب ہم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ہماری بیگم صاحبہ چھ سے زیادہ گنتی ہی نہیں جانتی ہیں، لہذا ہم نے آخری مرتبہ کہا۔

"تم چھ کس کو کہتی ہو"؟

بیگم نے ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں اور دوسرے ہاتھ کا انگوٹھا

اُٹھا کر کہا۔ "میں اس کو چھ کہتی ہوں"۔

ہم "یعنی وہ چھ کہ نصف جس کے تین ہوتے ہیں؟"

بیگم نے ہنس کر کہا۔ "آخر یہ آج آپ کو ہوا کیا ہے؟"

ہم نے کہا۔ "اچھا اب مذاق تو کر و ختم یہ بتاؤ کہ سب امرود کہاں ہیں؟"

اب بیگم نے قسم کھا کر کہہ دیا کہ صرف چھ امرود آئے ہیں اور ساتھ ہی خود نعمت خانہ سے وہ چھ امرود ہمارے سامنے لا کر رکھ دیئے جو لکھنؤ کی منڈی میں پیسہ ڈھیر کے حساب سے فروخت ہوتے ہیں۔

غالباً اس کے بعد یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ دوسرے دن ہم کو منڈی سے الہ آباد کے امرود اور بازار سے امرود کی جیلی کس تعداد میں لانا پڑی، البتہ یہ ضرور عرض کریں گے کہ لکھنؤ میں الہ آباد کے امرود سات آٹھ آنے سیر سے کم ملتے ہی نہیں اور ہم کو گویا چاہیئے تھے بیس[۲۰] پچیس سیر لہذا اس رقم اور دعوت کے مصارف کو ملا کر میزان کل پر ہماری بدھیا بیٹھی ہوئی نظر آتی تھی، باقی بیچے مبین تو ان کے متعلق ہماری وہی رائے اب بھی ہے جو امرود لانے سے قبل تھی اور غالباً وہی رائے صحیح بھی ہے۔

ہنسی

بہت سے واقعات نے ہم کو اس رائے پر پہنچا دیا ہے کہ ہنسی بھی ایک قسم کی دیوانگی ہے جس کا دورہ اکثر نہایت ہی غمناک موقعوں پر کچھ اس طرح پڑ جاتا ہے کہ سنجیدہ سے سنجیدہ انسان نہایت ہی خطرناک قسم کا پاگل نظر آنے لگتا ہے، خود ہماری رائے اپنے متعلق یہی ہے کہ ہم سنجیدہ ہوں یا نہ ہوں لیکن اس حد تک صحیح الدماغ ضرور ہیں کہ ہنسنے اور رونے کے محل میں امتیاز کر سکیں لیکن باوجود اس امتیاز کے ہم پر بارہا اس پاگل پن کے دورے پڑ چکے ہیں، طالب علمی کے زمانہ میں اس ہنسی کی بدولت پٹتے تھے اور پٹ کر بھی ہنسے جاتے تھے اب بتائیے یہ دیوانگی نہیں ہے تو اور کیا ہے کہ پٹنے کے بعد بجائے رونے کے ہنسی آئے، اسی طرح طالب علمی کے بعد عملی اور سنجیدہ زندگی میں بھی ہم کو اس ناگہانی ہنسی کی بدولت پاگل بننا پڑا ہے اور

جب ان واقعات کو یاد کرتے ہیں تو اپنی دیوانگی پر ہنسی بھی آتی ہے اور غصہ بھی۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ہمارے کسی ایسے عزیز قریب کا انتقال ہوا تھا کہ روتے روتے ہماری ہچکیاں بندھ گئی تھیں اور آج بھی جب مرحوم کا خیال آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اندر ہی اندر دل میں چٹکیاں لے رہا ہے، ان کے جنازہ کے ساتھ ہم بھی اسی طرح گئے تھے گویا خود ہماری روح کھینچ لیگئی ہے اور خدا جانے کس طرح قبرستان کی اس مسجد تک پہونچے تھے جہاں نماز جنازہ ہونے والی تھی، نماز جنازہ ادا کرنے کیلئے جبوقت صفیں درست کی جارہی تھیں خدا جانے کس نے ہم کو صف اوّل میں کھڑا کر دیا اور ہم بھی غیر ارادی طور پر اپنے غم واندوہ میں کھوئے ہوئے وہاں کھڑے ہو گئے کہ یکایک امام صاحب نے کہا "اللہ اکبر" اور ہم صدق دل سے خدا کے حضور میں سنبھل کر کھڑے ہو گئے اسلئے کہ یہ کوئی معمولی نماز نہیں بلکہ نماز جنازہ تھی جس کو ہر مسلمان موت کے ڈر سے نہایت ہی دل لگا کر ادا کرتا ہے، امام صاحب نے پھر فرمایا "اللہ اکبر" اور ہمارے قریب کھڑے ہوئے ایک بڑے میاں فوراً رکوع میں پہونچ گئے۔

بس ہم پر یکایک دیوانگی کا دورہ پڑا اور ہنسی کے مارے بُرا حال ہو گیا، دم گھٹنے لگا۔ آنکھیں نکلی پڑتی تھیں، تمام چہرہ سرخ تھا اور جسقدر ہم ضبط کرنے کی کوشش کر رہے تھے اسیقدر یہ دورہ اور بھی زیادہ شدید ہوتا جاتا تھا، بہر حال ہم تو کسی نہ کسی طرح ضبط کر لیجاتے مگر قیامت یہ ہوئی کہ کوئی اور صاحب بھی اس واقعہ سے متاثر ہو کر کچھ ایسے مغلوب ہوئے کہ ان کی "کھنچ کھنچ کھنچ اور ٹھیں ٹھیں ٹھیں" نے ہم کو بھی بے قابو کر دیا اور باوجود اس کے ہم نے ہنسی کے اس سمندر میں ڈوبنے کے بعد اپنی سانس روک لی تھی مگر ایک مرتبہ "کھل کھل" پر مجبور ہی ہو گئے، حالانکہ اس کے بعد ہم نے کھنکھار کر گلا اس لئے صاف کیا کہ ہماری "کھل کھل" کے سامعین اسکو بھی اس کھنکھار کا جزو سمجھیں مگر اس کا کیا علاج تھا کہ ہماری "کھل کھل" نے ہم سے پہلے ہنسنے والے کو اور بھی بے قابو کر دیا اور وہ نہایت واضح طور پر کھلکھلا پڑے اب ہمارے لئے یہ نہایت ہی دشوار کام تھا کہ ہم نماز میں کھڑے بھی رہیں اور ہنسی کو ضبط بھی کریں کہ عین اسیوقت امام صاحب نے کہا۔ "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" اور ہم نے دل میں کہا۔

موذن مرحبا بر وقت بولا تری آواز مکے اور مدینے

نماز کے بعد جو کچھ ہوا اُس کا ایک گہرا سا نقش آج بھی ہمارے
دل پر موجود ہے اور شاید قبر میں بھی ساتھ جائے گا لیکن خیریت یہ ہوئی
کہ مرنے والے عزیز جن کی یہ نماز جنازہ تھی ہمارے اسقدر قریبی عزیز تھے
کہ کسی کو اس موقع پر ہماری اس ہنسی پر اعتراض کرنے کی ہمت نہ ہوئی
اور آئی گئی سب ان حضرات کے سر گئی جو ہم کو اپنی ہنسی سے بے قابو
کر دینے کا باعث ہوئے تھے۔ ہم کو تو لوگ خیر گھور گھور کر ہی رہ گئے لیکن
انکی شان میں تو کھلی کھلی گستاخیاں کی گئیں کہ تم بدتمیز ہو نالائق ہو تم یہ ہو
اور تم وہ ہو اور اسوقت ان حضرت کا انفعال ہم سے پکار پکار کر کہہ رہا
تھا کہ ع

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

بتائیے کہ اس واقعہ کے بعد ہم ہنسی کو دیوانگی نہ سمجھیں تو کیا سمجھیں
غضب خدا کا کہ اپنے ایک عزیز قریب کی موت اور ہم جنازہ میں ہنسیں
اسکی امید سوائے ایک پاگل کے اور کس سے ہو سکتی ہے۔
اور سنئے کہ ایک مرتبہ نماز جمعہ میں ہمارے ساتھ ایک ایسے صاحب
نماز پڑھ رہے تھے جن کا ایک ہاتھ شانہ سے کاٹ دیا گیا تھا انکی یہ

حالت مضحکہ خیز نہیں بلکہ عبرت ناک تھی اور وہ یقیناً مستحق ہمدردی تھے
چنانچہ جب اُنھوں نے نیت باندھی تو صرف ایک ہاتھ استعمال کر سکے
اور اسوقت ہم کو ان سے بڑی ہمدردی پیدا ہوگئی وہ بیچارے ایک ہی
ہاتھ سے رکوع میں گئے اور ایک ہی ہاتھ سے سجدہ میں اور اسوقت
تک ہماری ہمدردی ان کے شامل حال تھی البتہ جب دعا کا وقت
آیا اور سب کے دو ہاتھوں کے ساتھ ان کا صرف ایک ہی ہاتھ اُٹھا تو
شیطان نے ہمارے کان میں کہا

"بندر اور آئینہ"

بس جناب کچھ نہ پوچھئے کہ ہم کو کس طرح صف میں سے پھاند کر
مسجد کے صحن میں اور مسجد کے صحن سے اپنے گھر کی جانب بھاگنا
پڑا، خدا جانے باقی نمازی ہم کو کیا کہتے ہوں گے لیکن ہمارا تو یہ حال تھا
کہ پیٹ میں سانس بھی نہ سماتی تھی اور مارے ہنسی کے آنکھوں سے
آنسو جاری تھے۔

ذرا غور تو کیجیے کہ یہ کون سا ہنسی کا موقع تھا اول تو نماز میں
ہنسی ویسے ہی گناہ ہے دوسرے جس بات پر ہنسی آئی تھی وہ تو

رونے کا مقام تھا لیکن جب ایک بات ناگہانی ٹھہری تو اس کے متعلق موقع اور محل کا سوال ہی نہیں ہو سکتا۔

ان واقعات کے علاوہ ایسا تو بارہا ہوا ہے کہ والد صاحب قبلہ کو ہم پر غصّہ آیا اور ہم کو ان کے غصّہ پر ہنسی، ان کو ہماری ہنسی پر اور بھی غصّہ آیا اور ہم کو ان کے غصّہ کی ترقی پر اور بھی ہنسی آئی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مارے غصّہ کے ہکلانے لگے اور ہم مارے ہنسی کے ہنسی کو ضبط نہ کر سکے، انھوں نے ڈانٹ کر کہہ دیا:۔

"دور ہو جاؤ میرے سامنے سے"۔

اور ہم دور ہو کر خوب جی کھول کر ہنس لیے لیکن اس سعادتمندی پر آج تک ہم اپنے آپ کو ملامت کرتے ہیں اور خدا جانے والد صاحب کا دل تو ہم سے کتنا ہٹ گیا ہو گا؟

یہ بھی ہوا کہ ایک مرتبہ ہمارے ایک مسن بزرگ ہم سے باتیں کر رہے تھے اور ہم تھے کہ ہم کو ان کا پوپلا منھ ہنسی کے شدید دورہ میں مبتلا کئے ہوئے تھا، اُنھوں نے ہم کو اپنے قریب بُلا کر کان میں کوئی بات کہنا چاہی اور ہم اپنی تمام سعادت مندی اور تمام ادب و تمیز کو

ایک ٹھٹھے میں اُڑا کر ہنسی کے مارے وہیں پر لوٹ گئے وہ بیچارے تو ہکا بکا رہ گئے لیکن ہم جو وہاں سے بھاگے ہیں تو اسوقت تک ہم کو ان کے سامنے جاتے ہوئے حجاب آتا رہا جب تک کہ وہ مر نہیں گئے اور آج تک اس ہنسی کی شرمندگی ہم کو پانی پانی کر دیتی ہے۔

اس مرض کا دورہ ایک مرتبہ ایک دعوت کے موقع پر بھی پڑ چکا ہے جب ہمارے منھ میں پلاؤ بھرا ہوا تھا اور ہمارے سامنے ہی دسترخوان پر ایک اور صاحب کچھ اس طرح کھانا کھا رہے تھے گویا اگر وہ دونوں ہاتھوں سے کام نہ لیں تو پلیٹیں ان کے سامنے سے بھاگ جائیں گی۔ ہمیں اسی موقع پر ہمارے ایک دوست نے کہنی مار کر اس طرف متوجہ کیا اور ہم نے متوجہ ہوتے ہی پلاؤ بھرے منھ سے وہ زبردست ہنسی کا پھنکارا مارا کہ ہمارے منھ کے تمام چاول بندوق کی گولی کی طرح ان پچاس لقمہ فی منٹ کی رفتار سے کھانیوالے حضرت کی پلیٹ میں گرے اور پھر قیامت یہ ہوئی کہ انھوں نے ایک دم سے اپنی تمام مشنری کو بند کر کے ہم کو تعجب سے گھورنا شروع کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کو اس خوان پُر تکلف سے بھوکا اُٹھنا پڑا لیکن خیریت

ہوئی کہ فوجداری کی نوبت نہیں آنے پائی۔

ان تمام واقعات کے بعد ہم کس طرح مان لیں کہ ہنسی دیوانگی کی کوئی قسم نہیں ہے۔ ہم تو اس کے قائل ہو چکے ہیں کہ ہنسی تو بجائے خود مکمل دیوانگی ہے۔ البتہ چونکہ واقعات اور محل مختلف ہوتے ہیں لہذا کہیں تو وہ ہنسی ہنسی رہتی ہے اور کہیں دیوانگی کا خطرناک دورہ بنجاتی ہے کسی کے راستہ میں گر پڑنے پر لوگ ہنس دیتے ہیں اور اس کو ہنسی کی بات سمجھتے ہیں، حالانکہ دراصل یہ ہنسی کی بات نہیں ہے بلکہ ہمدردی کرنے کا موقع ہے لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ دیوانگی کی یہ قسم اسقدر عام ہے کہ اب لوگوں کو ہنسی کے محل استعمال کا بھی امتیاز نہیں رہا ہے اور اس امتیاز کے اٹھ جانے ہی کا نام دیوانگی ہے۔
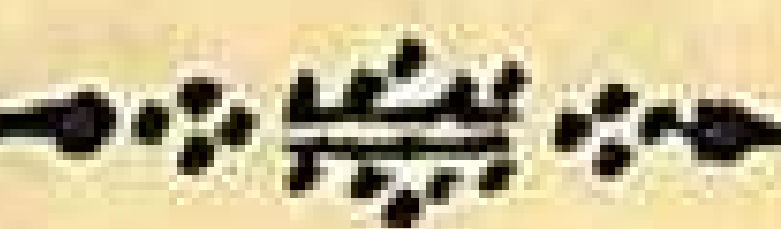
سالیاں

بیگم صاحبہ تو جس قدر نیک واقع ہوئی ہیں اس کو ہم ہی خوب جانتے ہیں یا ہمارا خدا جانتا ہے لیکن اُن کی تمام بہنیں ہمارے حق میں ایسی سعادتمند ہیں کہ خدا ہر ایک کو ایسی نسبتی بہنوں سے محفوظ رکھے، بیوی کے متعلق تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ع

درگلویم سنت پیغمبر است

لیکن بیوی کی بہنوں کے متعلق ہم نے کسی شرعی یا قانونی کتاب میں کوئی ایسی دفعہ نہیں دیکھی جس کے ماتحت ان کو یہ حق حاصل ہو کہ غریب دولہا بھائی کو جب جی چاہے بیوقوف بنادیا کریں اور ہر وقت اپنی بہن کے شوہر کا ناطقہ بند رکھیں معلوم نہیں تمام دنیا کے دولہا بھائیوں کا یہی حشر ہوتا ہے جو ہم دولہا بھائی کا تقریباً ایک درجن سالیوں کے ہاتھوں ہوتا رہتا ہے یا یہ بات ہمارے لئے ہی ہو قوف ہے بہر حال ہمارا تو یہ حال ہے کہ ان سالیوں نے اس کثرت سے بیوقوف بنایا ہے اور اس کثرت سے

ہم کو بیوقوف بنا کر ٹھٹھے اڑائے ہیں کہ اب خود ہم کو اپنی بیوقوفی کا احساس
ہونے لگا ہے اور خود ہم نے اپنے کو مضحکہ خیز سمجھ لیا ہے۔

شادی سے پہلے ہم کو اپنے بیوقوف ہونے کا کوئی واقعہ یاد نہیں
ہے یہ اور بات ہے کہ والدین پیار میں ہم کو بیوقوف کہتے ہوں، یہ ہم کو
اچھی طرح یاد ہے کہ ہماری بہنیں اکثر کہا کرتی تھیں کہ جو آپ کو بیوقوف
سمجھے وہ خود بیوقوف ہے لیکن شادی کرنے کی بیوقوفی کے بعد تو گویا
ہم اپنی سالیوں کے سر جیسے بن گئے اور ان ٹانگ برابر کی چھوکریوں نے
ہم کو اٹھا کر طاق پر بٹھا دیا، اس سلسلہ کی پہلی کڑی یہ ہے کہ ہم شادی کے
بعد جب پہلی مرتبہ اپنی سسرال گئے تو عجیب شان تھی وہاں ہم کو
بچوں سے لیکر بوڑھوں تک سب خدا جانے کیا سمجھتے تھے، کوئی
ہمارے لئے دیدہ دل فرش راہ کرتا تھا تو کوئی خود مجسّم بچھا جاتا تھا اور
ہماری خوشدامن صاحبہ نے تو گویا اپنے لخت جگر ہی سے ہماری
تواضع کی تھی مختصر یہ کہ ہم اس گھر کے داماد نہیں تھے بلکہ دیوتا تھے
جس کی سب پرستش کر رہے تھے ایسی جگہ اور ایسے ماحول میں
انسان کو اپنی اصلی قیمت کا اندازہ ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ اپنے

دماغ کو آسمان تک پہنچا دیتا ہے تقریباً یہی حال ہمارا تھا اور ہم اپنی اس شاہی میں کھوئے ہوئے تھے کہ ہماری سالی نمبر ۶ یا سالی نمبر ۷ نہایت ادب سے لجائی اور شرمائی ہوئی تشریف لائیں اور جھک کر سلام کرتے ہوئے ایک نہایت نفیس گلوری ہم کو مرحمت فرمائی، سچ تو یہ ہے کہ ہم تھے تباکو نوش دولھا اور جگہ تھی سسرال کی جہاں مارے شرم کے پان بھی نہیں مانگ سکتے تھے اور منھ میں رمضان شریف لئے بیٹھے تھے ایسی حالت میں یہ پان کیا ملا گویا زندگی مل گئی، ہم نے اپنی نیک سالی کو دعا دے کر پان لے لیا اور سب کی نظریں بچا کر چپکے سے منھ میں رکھ لیا، پان کھایا گئے اور اس حد تک اس کو کھایا کہ پیک تک نہ تھوکی۔

ہماری بیگم صاحبہ کی حقیقی بہنیں یعنی ہماری براہ راست سالیاں تو ہمارے سامنے ہی تھیں لیکن رشتہ کی سالیاں بھی پردہ کو پھاڑ پھاڑ کر اور دروازوں کی درازوں سے ہم کو دیکھ رہی تھیں، یہی وجہ تھی کہ ہم ہر ممکن احتیاط برت رہے تھے تاکہ ہم کو دیکھنے والیاں ہمارے متعلق کوئی بری رائے نہ قائم کریں لیکن پان کھانے کے بعد ہی یہ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا کہ ہماری سالی نمبر ایک یعنی بیگم صاحبہ کی اور ان کے

توسل سے ہماری ہمشیرہ محترمہ گولر کے پتوں کی ایک شاخ لئے ہوئے تشریف لائیں اور ہمارے سامنے رکھ کر کہا:۔

"اور کھاؤ"

ہم اس "اور کھاؤ" کا مفہوم قطعاً نہ سمجھ سکے اور سوالیہ "جی" ؟ کہہ کر رہ گئے تو انھوں نے فرمایا کہ " تم کو گولر کے پتے بہت مرغوب ہیں تو اور کھاؤ"۔

ہم اب بھی نہ سمجھ سکے تو ہماری بیگم کی آپا نے ہماری بلائیں لیکر سارا پھانڈا پھوڑ دیا کہ:۔

واہ ری لڑکیوں وہ تو بیچارہ کیسا بھولا ہے اور تم لوگ اس کو گولر کے پتے کھلا رہی ہو وہ غریب پان سمجھ کر کھا گیا"۔

یہ کہنا تھا کہ تمام گھر قہقہوں سے گونج اُٹھا اور ہم نے بھی تمام قصہ کی اصلیت سمجھ کر کچھ اس طرح ہنسنا شروع کیا کہ اگر روتے بھی تو ایسی ہی صورت بنتی البتہ یہ ضرور معلوم ہو رہا تھا کہ گویا سیکڑوں جوتے پڑ گئے ہیں، ہم اپنی کھسیانی ہنسی برابر ہنس رہے تھے اور بار بار دسمبر کے مہینہ میں نکلنے والے پسینہ کو اپنے سُرخ رومال سے خشک بھی کرتے

جاتے تھے کہ ہماری سالی نبرا نے نہایت متانت کے ساتھ ہم کو دوسرا پان دے کر اس قصہ کو ختم کر دیا اور اپنی چھوٹی بہنوں کی طرف سے معذرت چاہی کہ :-

بھیا یہ تمہاری سالیاں بڑی شریر ہیں ان کے مذاق پر برا نہ ماننا ان کا تم سے مذاق کرنے کا رشتہ ہے لو یہ پان کھالو"۔

ہم نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اس قصہ کو یہیں پر ختم کر دیں۔ لہذا یہ کہتے ہوئے کہ :-

"برا ماننے کی کون سی بات ہے"۔

پان کھا گئے اور خدا خدا کر کے وہ قہقہوں اور ٹھٹھوں اور کھلکھلاہٹوں کا طوفان ختم ہوا اب ہم کو بھی اپنے بیوقوف بن چکنے کا خیال ذرا کم ہونے لگا اور ہم اس طرح اطمینان سے بیٹھ گئے جس طرح طوفان کے گزر جانے کے بعد ایک اطمینان ہوتا ہے۔ لیکن اب ہمارے سامنے آئینہ پیش کیا گیا کہ ذرا رخ روشن کی زیارت تو کیجئے۔ اب جو دیکھتے ہیں تو تمام منہ لبوں سے حلق تک بلو بلیک روشنائی کی دوات بنا ہوا تھا، حلق سے معدہ تک کا حال خدا جانے

آئینہ دیکھ کر خدا جانے ہمارا کیا حال ہوا لیکن ہماری سالیوں کا تو یہ حال تھا کہ لوٹی لوٹی پھر رہی تھیں، مارے ہنسی کے پیٹ میں بل الگ پڑ رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو الگ جاری تھے، اسوقت ہم کو اپنی بیکسی پر واقعی رونا آرہا تھا، ہم نے بھی خدا جانے کتنے مذاق کئے ہیں اور کتنے لوگوں کو بیوقوف بنا کر چھوڑ دیا ہے لیکن اس موقع پر تو کچھ اس بُری طرح تختۂ مشق بنے تھے کہ آسمان کے دور ہونے اور زمین کے سخت ہونے پر غصہ آرہا تھا لیکن ایک اور مصیبت یہ تھی کہ ہم کو اس طرح بیوقوف بننے کے باوجود منھ نہ بنانا چاہیئے تھا بلکہ ہنسنا چاہیئے تھا ورنہ لوگ یہ سمجھتے کہ ہم بُرا مان گئے لہٰذا ہم ہنس بھی رہے تھے، اب اس ہنسی کو چاہے آپ ہمارا ہنسنا سمجھئے یا قسمت پر رونا، بہرحال باچھیں کھلی ہوئی تھیں حالانکہ نگاہیں نہ اُٹھتی تھیں اور دل یہ چاہتا تھا کہ نگاہیں چار کرنے سے پہلے ہی موت آجائے۔

لیکن اس مصیبت کے وقت خدا نے ہمارے خُسر کو رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیجدیا اور خدا خدا کر کے یہ بلا ٹل گئی ورنہ یہ سالیاں تو اُسی دن ہمارا منھ کالا کر کے گدھے تک پر سوار کر دیتیں اس لئے کہ ان کو تو

دولھا بھائی کے بہانے ایک کاٹھ کا اُلو ہاتھ آیا تھا بھلا اس سے زیادہ دلچسپی لینے کا اور کون موقع ملتا۔

اس کے بعد سے معمولی معمولی طور پر تو خدا جانے ہم کتنی مرتبہ بیوقوف بنائے گئے اور ہم کو بیوقوف خفی بننا پڑا لیکن عرصہ تک بیوقوف جلی بننے کی نوبت نہ آئی لیکن یہ بھی ہماری ایک بیوقوفی تھی کہ ہم کو اپنی نیک نہاد سالیوں کی طرف سے ایک قسم کا اطمینان سا ہو گیا تھا کہ پہلے جو ہم سے شرارتیں کی گئیں وہ غالباً اسی لئے کی تھیں کہ ہم نئے نئے دولھا بھائی تھے اور وہ نئی نئی ہماری سالیاں، لہٰذا انھوں نے اپنے تمام ارمان شد و مد سے نکال لئے اور اب ہم گھر کی مرغی بن کر دال برابر ہو گئے یعنی ہم کو زیادہ بیوقوف بنانے میں کوئی دلچسپی، کوئی کشش اور کوئی مزا باقی نہ رہا یہ سبب ہو کہ ان سالیوں کو در اصل ایسے دولھا بھائی کو بیوقوف بنانے میں لطف آتا ہے جو عقلمند ہوں جنکی چالاکی مسلّم ہو اور جو بڑے بقراط بنتے ہوں، ہمارے ایسے اُلو کو اُلو بنانے میں نہ تو کوئی کمال تھا اور نہ واقعی کوئی لطف آسکتا تھا۔

جو آپ ہی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا

بہر حال اب ہم سے صرف اسی قسم کا مذاق رہ گیا تھا کہ کبھی جوتا چھپا دیا گیا اور مٹھائی لیکر واپس کیا، کبھی کوئی دُھر یا پھل (قوام پھل) فراموش کر دیا اور ایک ایک کے دو دو ہزار پھل لیکر جان چھوڑ دی، کبھی منہ دھونے کے پانی میں رنگ ملا دیا اور کبھی نمک مٹی ہوئی شیر برنج کھلا کر خوش ہولیں، بہر حال اس معمولی معمولی مذاق کے علاوہ اور کوئی ایسی خاص بات پیش نہیں آئی جو قابل ذکر ہو سکے علاوہ اب ہم بھی نئے دولہا نہ تھے اور نہ نئے دولہا بلائی۔

اب ہم بھی اپنی سالیوں میں سوائے نمبر ا کے جو بڑی تھیں اور سب کو چپتیانے کا حق حاصل کر چکے تھے حالانکہ ہم نے کبھی ایسا کیا نہیں اور نہ یہ مناسب تھا خواہ وہ ہم کو کتنا ہی بیوقوف کیوں نہ بنا تیں اور خواہ ہم کو کتنا ہی بیوقوف کیوں نہ بننا پڑتا۔ رہ گئیں ہماری سالی صاحبہ نمبر ا وہ ہماری سسرال سے زیادہ خود اپنی سسرال میں رہتی تھیں لہذا انکی طرف سے تو گویا بالکل ہی اطمینان تھا۔

ہماری بیگم صاحبہ کی حقیقی بہنوں کے علاوہ رشتہ کی بہنیں بھی تھیں جو سب ہماری سالیاں تھیں، ان سالیوں کے علاوہ بیگم صاحبہ کی سہیلیوں کا

نمبر آتا ہے وہ بھی گویا ہماری سالیاں ٹھہریں اور اس اعتبار سے تو گویا مسلم گرلس ہائی اسکول ہمارے لئے "سالیستان" یا "ادارہ سالیات" کی حیثیت رکھتا تھا اور یہ ہر قسم کی سالیاں گویا اسی فکر میں رہتی تھیں کہ ایک جان ناتواں کو تختہ مشق بنائے رہیں ایسی صورت میں آپ ہی بتایئے کہ وہ کون دولھا بھائی ہے اس دنیا کے پردے پر جو اپنے کو بیوقوف بنائے جانے سے محفوظ رکھ سکے اور جس کو سالیوں کی یہ فوج ظفر موج باندھ کر اُلّو نہ بنا دے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ہماری ایک تعلیم یافتہ سالی یعنی بیگم صاحبہ کی ایک اپٹوڈیٹ سہیلی نے ان کو اپنے دولت خانے پر مدعو کیا اور انکے ساتھ ہم کو بھی۔ یہ سالی صاحبہ خندرو تھیں اور ہمارے سامنے آتی تھیں انکی صورت سے وہ شرارت ٹپکتی تھی جو عام طور پر سالیوں کے چہرے سے ٹپکا کرتی ہے لہٰذا ہم اُن سے بہت گھبراتے تھے اور ڈرتے رہتے تھے کہ اگر یہ مسماۃ ہم کو ستانے پر تل گئیں تو ہمارا خدا جانے کیا حال ہوگا اور کیا گت بنے گی چنانچہ اُن کے یہاں ہم یہ طے کرکے گئے کہ پھونک پھونک کر قدم رکھیں گے اور ذرا بھی غافل نہ ہوں گے، ورنہ خدا جانے کیا واردات پیش آئے۔

ہم ان کے یہاں پہونچتے ہی اٹینشن ہو کر کھڑے ہو گئے اور وہ ان تیاریوں پر مسکرانے لگیں۔

ہم نے کہا: "آپ سے مجھ کو بہت ڈر معلوم ہوتا ہے"۔

انھوں نے نہایت سادگی سے کہا: "کیا میں کاٹ کھاؤں گی؟"

ہم ہنستے ہوئے اس کرسی پر بیٹھ گئے جس پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا تھا لیکن اسکے بعد کیا ہوا؟ بس کچھ نہ پوچھئے معلوم یہ ہوا کہ ہم پر بجلی گر پڑی کرسی اوپر تھی ہم نیچے اور اسکا ٹوٹا ہوا پایا ہماری بغل میں، تمام کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا اور تو اور خود ہماری شریک رنج و راحت کو بھی اپنے سرتاج کی اس عزت افزائی پر ہنسی آ رہی تھی ہم نہایت پھرتی سے دامن جھاڑتے ہوئے اُٹھے اور ہمارے ہم زلف یعنی اُن سالی صاحبہ کے شوہر نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"کہیں چوٹ تو نہیں لگی"؟

ہمنے نہایت صفائی سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ "جی نہیں بچ گیا"۔

اور یہ کہتے ہوئے ہم ایک پلنگ پر جس پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی بیٹھ گئے لیکن بیٹھتے ہی یہ معلوم ہوا کہ گویا قبر میں گر پڑے، تمام پلنگ کی چادر سمٹ کر ہم سے لپٹ گئی تھی اور ہم چارپائی کے چوکھٹے میں ایک مزاحیہ تصویر بنے ہوئے پڑے تھے بڑی دیر تک تو سمجھ ہی میں نہ آیا کہ یہ ہوا کیا اور ہم کس حال میں ہیں لیکن جب ہمارے میزبان نے ہاتھ پکڑ کر ہم کو اس قبر کے

گڑھے سے نکالا تو پتہ چلا کہ اس چارپائی کو صرف ہمارے لئے بچھایا گیا تھا اور یہ بُنی ہوئی نہ تھی۔ اب ہم کو اسقدر غصہ آرہا تھا کہ اگر یہ کوئی ہماری رشتہ کی سالی ہوتیں تو ہمارے اُن کے تعلقات یہیں پر ختم تھے لیکن کیا کرتے مجبور تھے کہ رشتہ دار نہ تھیں۔

اُن کے شوہر نے اب ہم کو اس قابل رحم حالت میں دیکھ کر اپنی بیگم صاحبہ کو ذرا سنجیدگی سے منع کیا کہ اب کوئی مذاق نہو اور پھر ہم سے فرمایا کہ:-

"شاید تکلیف وہ مذاق نہایت ہی خوشگوار یادگار چھوڑ جاتا ہے"۔

ہم نے دانت پیس کر کہا۔ "بجا ارشاد ہے"۔

کہنے لگے۔ "ہندوؤں میں سالی اور بہنوئی کا مذاق بھی خوب ہوتا ہے"۔

ہم نے کہا۔ "جی ہاں اس کا تو اندازہ ہو گیا ہے"۔

لیکن اسکے بعد پھر ہم سے کوئی تیسرا مذاق اسلئے نہ کیا گیا کہ اب صرف ہنسی ہنسی میں جان سے مار ڈالا جا سکتا تھا اور تو کچھ باقی نہ رہا تھا۔

ہم نے تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتیں کیں کھانا کھایا اور اپنے پنڈت جی ہمزلف سے شطرنج کھیلنے بیٹھ گئے ادھر ہماری بیگم صاحبہ اپنی اسکولی بہن سے رازو نیاز میں مصروف ہو گئیں ہم نے جب بازی ختم کی اور بیگم نے چلنے کا تقاضہ

کیا تو ہم اُٹھے لیکن اس شان سے کہ تمام تخت کا فرش ہمارے ساتھ تھا اور معلوم ہوتا تھا ہم نے وہی گون پہن لیا ہے جو دہلی دربار میں ملکہ معظمہ پہن کر تشریف لائی تھیں۔ سب نے ہنسنا شروع کیا اور ہم پھر غور کرنے لگے کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ بہت تحقیق اور تفتیش کے بعد پتہ چلا کہ ہماری شیروانی کا دامن فرش سے سی دیا گیا تھا۔

خیر یہ مذاق چونکہ تکلیف دہ نہ تھا لہذا ہم کو غصہ نہیں آیا صرف ہم جھینپ کر رہ گئے۔

اب کہاں تک ان سالیوں کی کرم فرمائیوں اور دولھا بھائی نوازیوں کا ذکر کیا جائے۔ اگر ہم زندگی بھر لکھتے رہیں تو بھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہو سکتا۔ ہم تو سالیوں کے معاملہ میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ؎

خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے خصوصاً سالیوں کی اس وبا سے

آخر میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ابھی ہماری سالیوں کی بیزان گل نہیں نکلی ہے اسلئے کہ پیداوار بفضلہ جاری ہے اور ایک آدھ خسر صاحبان ابھی تک کنوارے بھی ہیں، دیکھئے وہ اس تعداد میں کسقدر اضافے کرتے ہیں۔

درگاہ شریف

نئی سڑک کی زد میں ہمارا مکان بھی تھا اور ہمارے پڑوسی میر صاحب کا مکان بھی، لیکن میر صاحب کیلئے یہ صدمہ کچھ ایسا روح فرسا واقع ہوا تھا کہ ان کے ساتھ ہمدردی کرنے میں ہم کو اپنے مکان کا غم کرنے کی مہلت ہی نہ ملتی تھی وہ دن رات اپنے مکان کے تاراج ہونے کے تصور سے کچھ اس طرح رویا کرتے تھے کہ گویا ان کا جوان بیٹا تپ دق میں مبتلا ہے اور آج ہی کل کے اندر داغ جدائی دینے والا ہے، ہم نے ان کو لاکھ لاکھ سمجھایا کہ اس مکان کا کچھ نہ کچھ معاوضہ میونسپلٹی ضرور دیگی مگر وہ اپنے باپ دادا کی اس نشانی کو کسی معاوضہ پر مٹانے کیلئے تیار نہ تھے۔ ہم نے ان سے یہ بھی کہا کہ دیکھو میر صاحب ہم اور تم دونوں ایک ہی کشتی پر ہیں مگر وہ اسکا جواب بھی یہی دیدیتے تھے کہ تمہارا ایک نہیں تو دوسرا مکان ہے مگر میرا تو یہی ایک جھونپڑا ہے اور جب یہ بھی مسمار کر دیا جائیگا تو میرے لئے سر رکھنے کو بھی کہیں جگہ نہ

ہو گی، مختصر یہ کہ میر صاحب کا مکان تو خیر کچھ دنوں کے بعد کھُدنے والا تھا لیکن وہ ابھی سے مرے جاتے تھے اور روز بروز انکی حالت ابتر ہی ہوتی جاتی تھی۔

اگر ہم یہ کہہ دیں کہ ہم کو اپنے غریب خانہ کی فکر نہ تھی تو جھوٹ ہوگا البتہ یہ واقعہ ضرور ہے کہ ہم بجائے رونے اور جان کھونے کے ان تدابیر کے غور میں محو رہتے تھے جس سے نئی سڑک کا راستہ تبدیل ہو سکے اور ہمارا مکان بچ جائے لیکن میر صاحب کا یہ کہنا بھی سچ تھا کہ جب سڑک کا نقشہ بن چکا، بن کر منظور ہو چکا اور تمام کارروائی ہو چکی تو ایسی صورت میں ہماری کون سی تدبیر کارگر ہو سکتی ہے مگر ہم اس معاملہ میں کچھ نپولین قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں کہ آخر وقت تک تھکتے نہیں اور کسی ناممکن بات کو ناممکن نہیں سمجھتے اور میر صاحب قبلہ اُن لوگوں میں سے تھے جو مصیبت پڑنے سے بہت پہلے محض نازل ہونیوالی مصیبت کے تصور سے کچھ ایسے مصیبت کے مارے ہو جاتے۔ تھے کہ ان کو دیکھ کر ترس آئے۔

بہر حال ہم اپنے کام یعنی تدابیر کے غور و فکر میں مصروف تھے، اور وہ

اپنے کام جینی رونے اور مرنے میں محو تھے۔ آخر ایک روز بالکل الہامی طریقہ پر ہمارے ذہن میں ایک ایسا خیال آیا کہ ہم اُچھل پڑے پھر اس پر غور کیا اور پھر اچھل پڑے پھر اس کے گرد وپیش پر نظر ڈالی اور پھر مارے خوشی کے اُچھل پڑے سچ تو یہ ہے کہ اسوقت ہم کو اپنے تدبر اور دانشمندی پر جس قدر مسرت ہو رہی تھی اُسیقدر اس بات پر افسوس تھا کہ حکومت کے ارباب حل وعقد میں ہمارے ایسے عالی دماغ شامل کیوں نہیں ہوتے بہر حال ہم اسوقت مارے خوشی کے مرے جا رہے تھے اور اس بات پر ہم کو انتہائی قلق ہو رہا تھا کہ ہماری اس ذہانت کا قدردان کوئی نہیں ہے ورنہ یہ بات تو ایسی ہمارے ذہن میں آئی تھی کہ ہم کو موتیوں میں تولا جاتا۔

ہم انتہائی جوش کے ساتھ اپنے گھر سے نکل کر میر صاحب کے دروازہ پر پہنچے اور ڈپٹ کر اُن کو آواز دی "میر صاحب"! انھوں نے اپنی مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ تو ہم نے پھر نہایت شان کے ساتھ اُن کو پکار کر کہا کہ "جلدی آؤ"۔

میر صاحب اپنی دلائی میں لپٹے ہوئے گھر سے برآمد ہوئے اور ہمنے ان کا بازو پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا اور گھسیٹتے ہوئے اپنے گھر لے آئے

میر صاحب کو گھر کے اندر لاکر اپنے پاس بٹھایا اور اُن کے کان کے قریب منھ لاکر کہا۔" وہ مارا۔"

میر صاحب کچھ سہم سے گئے مگر ہم نے ان کو محبت کے جوش میں پھر جھنجھوڑ کر کہا۔" وہ مارا میر وہ مارا"۔

اب میر صاحب کچھ ایسی نظروں سے ہم کو دیکھ رہے تھے کہ گویا ہماری دماغی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور غالباً اُن کے ذہن میں یہی خیال ہو گا کہ مکان کے انتہائی غم نے ہمارے دماغ پر اثر کیا ہے۔ بہر حال ہم نے ان کو زیادہ پریشان نہ ہونے دیا اور انکے قریب بیٹھ کر رازدارانہ طریقہ پر کہنا شروع کیا۔

"دیکھو میر صاحب وہ لاجواب ترکیب سوجھی ہے کہ ہمارا مکان بھی بچ جائے اور تمھارا مکان بھی بلکہ لگے ہاتھ تمھاری موجودہ بیروزگاری کا بھی خاتمہ ہو جائے"۔

اب میر صاحب کی آنکھوں میں مسرت کی چمک پیدا ہوئی اور انھوں نے بھی بدحواس ہو کر منھ کھول دیا۔

ہمنے کہا۔ "میر صاحب واللہ تم ہی داد دے سکتے ہو ایسی لاجواب ترکیب۔ بس

میں خود نہیں سمجھ سکتا کہ کس طرح میرے ذہن میں آگئی مجھ کو۔۔۔"

میر صاحب نے بات کاٹ کر کہا۔" ارے یار کچھ کہو گے بھی یا یوں ہی اپنی شان میں قصیدہ کہہ کہہ کر ترساتے رہو گے"۔

ہم نے ایک ادا کے ساتھ کہا۔" اگر ایسی جلدی ہے تو جانے دو"۔

میر صاحب نے ناز بردارانہ طریقہ پر چمکار کر کہا۔" اچھا نہیں نہیں تم کہو"۔

ہم نے پھر کہنا شروع کیا:۔

مجھ کو واقعی سخت حیرت ہے کہ یہ ترکیب کس طرح میرے ذہن میں آگئی یعنی بیک وقت مکان بھی بچ گیا اور تمہاری مستقل آمدنی کا بھی انتظام ہوگیا تم کو خدا کی قسم ذرا غور تو کرو تم مجھ کو بیوقوف سمجھتے تھے لیکن آج خدا کو یہ منظور تھا کہ تم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے میرے معتقد ہو جاؤ اور تم ہی پر کیا منحصر ہے"۔

میر صاحب نے بے صبری سے خوشامد کرتے ہوئے کہا:۔

"اچھا اب وہ بات بتادو کیوں اسقدر مشتاق بنا رہے ہو"؟

ہم نے جوش میں ان کے زانو پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا:۔

"واللہ تم بزرگ ترین انسان بن جاؤ گے اور نہ صرف تمہارا گھر تاراج ہونے سے بچ جاتا بلکہ تمہارے صدقہ میں ہم بھی بچ جائیں گے اور اگر

اللہ نے چاہا تو تمہارے گھر پر سونا برسے گا سونا"۔

اب میر صاحب مارے اشتیاق کے نزع کے عالم میں تھے آخر کار ان سے ضبط نہ ہو سکا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے :۔

"اچھا اب خدا کے واسطے بتا دو"۔

ہم نے ان کا شانہ ہلا کر کہا۔ "دیکھو میر صاحب یہ بات بس میرے اور تمہارے درمیان رہے ورنہ ——"

میر صاحب نے سنجیدگی سے کہا:۔

"اجی توبہ کرو میں تو اپنے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہونے دوں گا"۔

ہم نے آواز دھیمی کر کے رازدارانہ طریقہ پر کہا:۔

"وہ تمہارا شجرہ محفوظ ہے نا؟"

میر صاحب نے کہا۔ "ہاں ہاں محفوظ ہے، لاؤں؟"

ہم نے کہا۔ "اور وہ کتبہ جو تمہارے جد امجد کو کسی جہاد کے موقع پر ملا تھا؟"

میر صاحب نے کہا:۔ "وہ جس پر کسی بزرگ کی تاریخ وفات کندہ ہے؟ ہاں وہ بھی رکھا ہے"۔

ہم نے میر صاحب کو ہونہار فرزند کی طرح گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "بس تو پھر فتح ہے"۔

میر صاحب نے پھر بے صبری سے کہا۔

"ارے یار فتح تو ہے مگر ہم کو بھی تو بتاؤ"۔

ہم نے ان کے منھ کے قریب اپنا منھ لاکر چپکے چپکے کہنا شروع کیا۔

"دیکھو میر صاحب بس یہی ایک ترکیب ہے کہ تم جلد سے جلد نہایت رازدارانہ طریقہ پر اپنے مکان کے اُس سرے پر جو زمین خالی پڑی ہے ایک قبر زمین کے نیچے ہی نیچے اس طرح تیار کرو کہ وہ مکان کی دیوار سے ملی ہوئی ہو لیکن اس قبر کی تیاری میں یہ کمال دکھانا ہے کہ وہ کم سے کم دو سو برس کی پرانی معلوم ہو اور اسی قبر میں وہ کتبہ اس طرح رکھ دیا جائے کہ جیسے ہی اس مقام پر پھاوڑا چلے بس وہ کتبہ نکل آئے۔ پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے"۔

میر صاحب نے خوشی کے مارے بے قوف ہو کر کہا۔

"واقعی فتح ہے وہ مارا۔ مگر یار ــــــ"

ہم نے ان کو چپ کرتے ہوئے کہا "بس اگر مگر کچھ نہیں، جو میں

کہہ رہا ہوں وہ کرو' اس کے بعد میرا ذمّہ۔

میر صاحب نے ہمارے آگے سرِ تسلیم خم کر کے کہا۔

"جو تم کہو گے انشاء اللہ وہی ہو گا۔"

ہم نے کہا۔ "ابھی پوری بات تو تم نے سنی نہیں داد طلب تجویز تو یہ ہے کہ اس قبر سے ایک اندرونی راستہ تمہارے گھر میں ایسا آتا ہو کہ جس وقت قبر پر چھاڑ ا چلے فوراً ہی عطر کی خوشبو کا بھپکا اور لوبان کا دھواں نکل پڑے۔"

میر صاحب نے اپنی حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے پوچھا۔

"اس سے مطلب؟"

ہم نے کہا۔ "اس سے مطلب یہ کہ تم ہو گھامڑ۔ ارے گدھے کہیں کے۔ لاحول ولا قوۃ۔ بھئی میر صاحب معاف کرنا غلطی سے تمہاری شان میں ایسی گستاخی ہو گئی۔"

میر صاحب نے نہایت شرافت سے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "کوئی حرج نہیں' کوئی حرج نہیں۔"

ہم نے کہا۔ "ارے بھائی اس کا مقصد یہ ہے کہ جب وہ کتبہ نکلے گا

اور اس کے بعد یہ معجزہ ہوگا تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ یہ کسی پہنچے ہوئے اللہ والے بزرگ کا مزار ہے، اس کے بعد بس ہمارا کام یہی رہ جاتا ہے کہ ان بزرگ کو آپ کے شجرہ میں ثابت کردیں اور یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے۔

میر صاحب نے اپنے کو مجوزہ دادا جان کا پوتا ثابت کرنے کے انداز سے کہا۔" ارے بھائی مشکل کیا ہے؟ وہ تو بہت آسان ہے میرے دادا جان مرحوم نے اس کتبہ کو اسی لئے تو اٹھالیا تھا کہ اس کا نام ہمارے شجرہ کے ایک نام سے ملتا جلتا تھا، لہذا دادا جان کو یہ شبہ ہوا کہ یہ کتبہ ہمارے ہی عزیز بزرگ کا ہے"۔

ہم نے کہا۔" جی ہاں اسی مناسبت کی بنا پر تو یہ سب کھیل کھیلا جارہا ہے۔ اب آپ خدا کا نام لے کر اس زمیں دوز مزار کی تیاریاں کیجئے اور اپنے گھر کی طرف سے اطمینان رکھئے"۔

اس مسئلہ کے طے ہو جانے کے بعد میر صاحب کو قطعی اطمینان ہوگیا بلکہ اسوقت بھی ان کے چہرے پر کوئی پریشانی کی علامت پیدا نہ ہوئی جب انکے دولتخانے کے قریب والے مکانات پر پھاوڑا چل رہا تھا

اور ان مکانات کی اینٹ سے اینٹ بج رہی تھی میر صاحب اپنے
مکان کا سامان نہایت اطمینان کے ساتھ ایک دوسرے مکان میں
منتقل کر رہے تھے اور ہم بھی بظاہر اپنے مدت کے ساتھی مکان کو
رخصت کر رہے تھے لیکن چونکہ ہمارے اور میر صاحب کے تمام انتظامات
مکمل تھے لہذا دونوں کو نہ صرف اطمینان تھا بلکہ میونسپلٹی کی حماقت
شعاری پر دل ہی دل میں ہنسی آ رہی تھی۔

آخر کار وہ دن آ پہنچا جب میر صاحب کے دولتخانہ کو میدان
بنجانا چاہیئے تھا میر صاحب کے مکان سے ملے ہوئے مکان پر
پھاوڑا چلنے لگا اور ہم اپنے پڑوسی میر صاحب کی اس خانہ ویرانی کا
تماشہ دیکھنے کیلئے موقع پر پہنچ گئے لیکن میر صاحب موجود نہ تھے غالباً
وہ اس لئے نہ آئے ہوں گے کہ خود اپنی آنکھوں سے اپنی بربادی
نہ دیکھ سکتے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کھنڈر بالکل میدان بنا دیا
گیا اور اب میر صاحب کے دولتکدہ کی باری تھی مگر خدا کی قدرت کے
قربان جائیے کہ جیسے ہی بیلدار نے دو تین پھاوڑے چلائے ایک
کتبہ اُس کے پھاوڑے میں آگیا اور ساتھ ہی نہایت تیز عطر کی لپٹ کے

ساتھ لوبان کی خوشبو ہوا میں پھیل گئی بیدار صاحب تو دو تین قدم پیچھے ہٹ گئے لیکن دوسرے کاریگروں، مزدوروں اور تماشائیوں کو اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔ عطر کی خوشبو ہوا میں برابر پھیل رہی تھی اور لوبان کی خوشبو سے تمام محلہ مہکا ہوا تھا یہاں تک کہ سب اور سیر صاحب بھی موقع پر آگئے اور تمام واقعہ کی تفصیل معلوم کرنے کے بعد اس متبرک کتبہ کو نہایت احترام اور عقیدت کے ساتھ اٹھا لیا اس پر جو حروف کندہ تھے ان کو بغور دیکھا گیا تو بہ مشکل تمام یہ عبارت پڑھی گئی۔

"دلبر شاہ ــــ در جنگ کھیتھو کا شہید شد ۱۰۳۹ھ"

اس کتبہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ کسی شہید مرد کا مزار ہے اور اب لوگ جوق در جوق مزار شریف کی زیارت کے لئے آنا شروع ہو گئے۔ خود ہم نے جب یہ دیکھا کہ زائرین کی تعداد کثیر کے علاوہ میونسپل انجینیر اکزیکیٹو افیسر اور ایک آدھ ممبران میونسپل بورڈ موقع پر موجود ہیں تو نہایت عقیدت سے کتبہ کو بوسہ دیا اور وہاں کی خاک کو چاٹنے اور آنکھوں میں لگانے کے بعد گویا عوام کی توجہ اس پر مبذول کی جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہی سب کو کرنا چاہیئے چنانچہ ابھی ہم اٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ معتقدین کا جم غفیر اسی

عقیدت کے لئے کود پڑا اور اس کے بعد پھر کیا تھا معجزات شروع ہو گئے، والدین اپنے بچوں کو خاک پاک چٹانے کے لئے لانے لگے اندھے بینائی حاصل کرنے کو مزار شریف کی خاک آنکھوں سے لگانے لگے، مفلوج اپنے اعضاء معطل کی صحت کیلئے وہاں موجود ہو گئے۔ ڈولیوں پر ڈولیاں، یکّوں پر یکّے، تانگوں پر تانگے، گاڑیوں پر گاڑیاں اور موٹر پر موٹر آنا شروع ہو گئے اور تھوڑی ہی دیر میں اچھا خاصہ سلسلہ لگ گیا، یہاں تک کہ مزار شریف کی حفاظت کیلئے اہل محلّہ کو متوجہ ہونا پڑا اور ہماری تحریک پر مجاوری کی خدمات جناب میر صاحب قبلہ کے سپرد کی گئیں جو نہایت باقاعدگی کے ساتھ کتبہ کو بوسہ دلواتے، چڑھاوے وصول کرتے اور نذرانے قبول کرتے رہے اب سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ اس مزار کو باقاعدہ درگاہ کی صورت میں خود میونسپلٹی کے خرچ سے تعمیر کرایا گیا اور چونکہ اب اس کے حائل ہو جانے سے سڑک کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا تھا لہٰذا اسی جگہ سے سڑک اسطرح موڑ دی گئی کہ میر صاحب کا اور ہمارا مکان نہ صرف صاف بچ گیا بلکہ لب سڑک بھی ہو گیا۔

ہم نے تاریخ دانی سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اسی مقام پر سنہ ۱۰۳۹ھ

میں جنگ بھبھو کا ہوئی تھی جس میں بہت سے بزرگان دین کے علاوہ حضرت دلبر شاہ قدس سرہ کی شہادت بھی واقع ہوئی تھی اور چونکہ میر صاحب کے شجرے میں حضرت دلبر شاہ کا اسم گرامی موجود ہے لہذا یہ بھی ثابت ہوا کہ حضرت دلبر شاہ کی اولاد میں جناب میر صاحب کی ذات بابرکات ابھی باقی ہے لہذا میر صاحب کو صحیح وارث کی حیثیت سے سجادہ نشین قرار دیکر گدی پر بٹھا دیا گیا اور آپ کے حلقۂ ارادت میں سب سے پہلے اسی خاکسار نے اپنے کو پیش کیا۔

میر صاحب میں اس کے بعد کیا تغیرات پیدا ہوئے اسکا اندازہ صرف دیکھنے سے کیا جاسکتا ہے کسی نے سچ کہا ہے کہ ع

خدا جب حُسن دیتا ہے نزاکت آہی جاتی ہے

بالکل یہی حال میر صاحب کا تھا کہ ع

خدا جب پیر کرتا ہے کرامت آہی جاتی ہے

یعنی آپ کی داڑھی ایک طرف سے اور کاکلیں دوسری طرف سے بڑھنا شروع ہوگئیں، نماز اور وظیفہ کے علاوہ ایک بڑی لمبی سی تسبیح بھی ہاتھ میں رہنے لگی یہاں تک کہ رفتہ رفتہ سر پر چوگوشیہ ٹوپی، بدن پر لمبا سا کرتا اور

ٹخنے کھلا پائجامہ پہن لیا گیا اور میر صاحب اب سچ مچ کے شاہ صاحب تھے، بچّوں پر دم کرتے تھے ہر مرض اور ہر کام کے لئے آپکے تعویذوں کی دھوم تھی، یہاں تک کہ آپ کو قوالی میں ایسا خوفناک قسم کا حال آتا تھا کہ دیکھنے والے دہل جائیں۔

میر صاحب کے یوں تو ہم مرید تھے لیکن درحقیقت وہ ہمارے ہی ارادت کیش تھے۔ ہر روز رات کے وقت ہمارے پیر مرشد ہم سے اپنی مزید مکاریوں کیلئے مشورہ فرماتے تھے اور ہمارے مشوروں پر چل کر تھوڑے ہی دنوں میں وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ بذات خود اپنے فرائض انجام دے سکیں۔

میر صاحب نے اپنی شرافت سے ہم کو بھی اس نفع میں شامل کرنا چاہا جو ہماری وجہ سے ان کو پہنچ رہا تھا لیکن ہم نے اسی کو غنیمت سمجھا کہ ان کے طفیل میں نہ صرف ہمارا مکان بچ گیا بلکہ لب سڑک رہتے تھے عمدہ سے عمدہ درگاہ شریف کا تبرک کھاتے تھے اور میر صاحب کا ایسا مسلم الثبوت بزرگ ہمارے زیر اثر تھا۔

برکت

کیا مسلمان اور کیا ہندو سب خدا کے فضل سے ہمارے ایسے
زیر اثر تھے کہ ہماری ایک آواز پر قصبہ کے تمام لوگ فوراً اس طرح آموجود
ہوتے تھے کہ گویا سب ہمارے زرخرید غلام ہی تو ہیں اور واقعی اس اثر
اور اقتدار کے ہم مستحق بھی تھے بات یہ تھی کہ تمام قصبہ میں جب کسی پر کوئی
مصیبت پڑتی تھی اسکی خدمت کیلئے سب سے پہلے جو آگے بڑھتا تھا وہ ہم
ہی تھے اسیوجہ سے ہم کو ایسی ہر دلعزیزی حاصل ہو گئی تھی کہ بلا مبالغہ اگر
ہم اپنے اہل قصبہ سے اشارۃً بھی یہ کہہ دیتے کہ دہلی کا قلعہ فتح کر لو تو وہ
بغیر سمجھے بوجھے کم سے کم دہلی کے قلعہ پر ایک حملہ تو کر ہی دیتے پھر جو
کچھ ہوتا دیکھا جاتا لیکن ہم نے اپنے اس اثر اور اقتدار سے کبھی کوئی ناجائز
فائدہ نہیں اٹھایا اور اپنی خدمت کبھی کسی سے نہ لی تا کہ ہماری خدمات
بیغرض ثابت ہوں اور واقعی ان بیغرض خدمات نے ہم کو اپنے قصبہ کا
مہاتما گاندھی بنا دیا تھا اور ہم خود بھی اپنے کو جہاں تک اپنے قصبہ کا

تعلق ہے مہاتما گاندھی سے کم نہ سمجھتے تھے بلکہ ہم کو امید تھی کہ اگر ہماری ہر دلعزیزی یونہی ترقی کرتی رہی تو وہ دن دور نہیں جب ہم رفتہ رفتہ ہندوستان بھر کے متفقہ رہنما اور نجات دہندہ سمجھے جائیں گے۔

ہمنے اخبارات میں پڑھا کہ مہاتما گاندھی نے اچھوتوں میں ہر دلعزیز ہونے کیلئے اچھوتوں کو ہندوؤں کے سر پر چڑھانے کی تحریک شروع کی ہے اور اس تحریک کیلئے عام ہمدردی حاصل کرنے کو فاقہ کشی یعنی برت شروع کر دیا ہے۔ گاندھی جی کی اس ذہانت پر ہم پھڑک اُٹھے اور وہ راز ہماری سمجھ میں آگیا جس نے گاندھی جی کو مہاتما گاندھی بنایا ہے۔ ہم نے بحیثیت اپنے قصبہ کے گاندھی ہونے کے چاہا کہ اپنے قصبہ میں بھی یہی حرکت ہم بھی کریں لیکن پھر ہمنے خود ہی سوچا کہ اسکو لوگ نقالی کہیں گے لہٰذا بہت کچھ غور و فکر کرنے کے بعد ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم اسی بات کو اس طرح پیش کر سکتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سے چھوت چھات اُٹھانے کی تحریک شروع کریں اگر ہم کامیاب ہوگئے تو سبحان اللہ ہم نہ صرف اپنے قصبہ میں مشہور ہو جائیں گے بلکہ یہ شہرت تو ایسی ہوگی جو ہمارا نام قصبہ کے باہر ضلع بھر میں لے اڑے گی اور پھر ہم اپنے کو قصبہ کے باہر تمام

ہندوستان میں بھی اسی تحریک کی بدولت روشناس کرا سکتے ہیں اور اگر خدانخواستہ یہ تحریک ناکام ہوئی جس کا ایک فیصدی بھی امکان نہ تھا تو بھی ہمارا برت کچھ کم شہرت کی چیز نہ ہوگا بلکہ تھوڑے ہی دنوں میں ہندوستان بھر میں دو برت رکھنے والوں کی شہرت ہوگی ایک مہاتما گاندھی جو اچھوت ادھار کیلئے برت رکھ رہے ہوں گے، دوسرے مہاتما تماہم جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سے چھوت چھات ختم کرنے کیلئے برت رکھ رہے ہوں گے بلکہ ہماری شہرت کے امکان اسلئے زیادہ تھے کہ ہماری تحریک کا تعلق مساوی طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے تھا مگر گاندھی جی کی تحریک صرف ہندوؤں سے متعلق تھی۔

ہمنے اپنے کو ہندوستان گیر گاندھی بنانے کیلئے موقع کو غنیمت سمجھا اور انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس تجویز کے تمام نشیب و فراز پر پوری طرح غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ یہ تحریک تو ایسی ہے کہ اگر ہم کامیاب ہو گئے تو' اور اگر ناکام ہوئے تو بہر حال دونوں صورتوں میں ہمارا مہاتما بنجانا یقینی ہے لہذا ہم نے غور و فکر میں زیادہ وقت خراب کرنے کے بجائے یہی مناسب سمجھا کہ تمام قصبہ میں ایک

جلسہ عام کا اعلان کر دیا اور طے کر لیا کہ اسی جلسہ میں ہم نہایت صفائی کے ساتھ اپنی تحریک پیش کر دینگے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہدیں گے کہ اگر ایک ہفتہ کے اندر تمام قصبہ کے ہندو اور مسلمان ہم پیالہ اور ہم نوالہ نہ ہو گئے تو ہم غیر معینہ مدت کیلئے برت شروع کر دیں گے اور اس برت کی انتہا موت ہو گی۔

ہم کو یقین تھا کہ ہمارے اہل قصبہ ہم کو برت رکھنے کا موقع نہ دینگے اور ہماری محض اس دھمکی ہی کا یہ اثر پڑے گا کہ سب ہندو اور مسلمان ایک دسترخوان پر نظر آئیں گے لیکن ہم کو تعجب ہے کہ اول تو اس جلسہ ہی میں ہماری اس تجویز کی نہایت شدت سے مخالفت کیگئی اور مخالفت بھی اُن لوگوں نے کی جن کے متعلق ہم کو یقین تھا کہ ہمارے ایک ادنیٰ سے اشارے پر اپنی جان تک دینے میں دریغ نہ کریں گے، دوسرے یہ ہوا کہ ہمارے اس جلسہ کے بعد اس ایک ہفتہ کے اندر خدا جانے کتنے اور جلسے ہو گئے جنمیں ہماری تجویز کی مخالفت کیگئی اور تمام قصبہ کے ہندوؤں کو ہندوؤں نے یہ کہہ کر بھڑکا دیا کہ ہم گویا ان کا دھرم لینا چاہتے ہیں اور مسلمانوں نے مسلمانوں کو یہ کہہ کر بہکایا کہ ہم ہندوؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے

قائم رہا بلکہ اب تو ہم کو خود بھی اپنے اوپر اعتماد ہوگیا کہ جب ایسی آزمائشوں سے ہم صاف بچ گئے تو اب یقینی فتح ہوگی اور واقعی ان آزمائشوں کے بعد ہم نے اپنے آپ کو اور بھی زیادہ غیر متزلزل پایا۔

آج کی رات کل سے بھی زیادہ صبر آزما تھی اول تو نیند آتی ہی نہ تھی اور اگر کمزوری کی وجہ سے غنودگی طاری بھی ہوتی تھی تو فوراً معدہ کی ناقابل بیان تکلیف بیدار کردیتی تھی اور ہم کروٹیں بدل رہے تھے تمام گھر میں سناٹا تھا سب ہی نیند سو رہے تھے ایک ہم ہی تھے جو اپنے قصابانی حق کو بیدار کرنے کیلئے خود بھی بنفس نفیس بیدار تھے بار بار دل چاہا کہ اس رات کی تاریکی میں چپکے سے اُٹھ کر نعمت خانہ میں رکھا ہوا دودھ اٹھا کر پی لیں کون دیکھتا ہے مگر پھر خود ہی اس چوری کے خیال پر دل ہی دل میں نفرت کا اظہار کیا، پھر تھوڑی دیر کے بعد یہی خیال نہایت پختگی کے ساتھ پیدا ہوا اور پھر ہم نے اپنے بر ستی کی روحانیت کو اس پر غالب کر دیا لیکن تیسری مرتبہ تو ہم اسقدر مغلوب ہو گئے کہ اسی ارادہ کو تکمیل تک پہنچانے کیلئے اُٹھ کر بیٹھ گئے مگر پھر لاحول پڑھ کر لیٹ رہے اور سونے کی کوشش کرتے رہے آخر کار چوتھی مرتبہ اس خیال کے پیدا ہونے کا

احساس ہم کو اُسوقت ہوا جب دودھ پینے کے بعد ہم نعمت خانہ کو نہایت احتیاط سے بند کر رہے تھے۔

دودھ کوئی سیر بھر ہوگا اور وہ سب ہمارے معدہ میں پہنچکر ایسا باعث تسکین ثابت ہوا کہ ہم فوراً نیند میں غافل ہو گئے اور صبح اسوقت آنکھ کھلی جب ہمارے چند ہمدرد ہماری عیادت کیلئے آئے ہوئے تھے اور ہم کو کمزوری کے باعث غافل سمجھ کر بیٹھے ہوئے افسوس کر رہے تھے۔ ہم کو ہوشیار دیکھ کر ایک صاحب نے کہا :۔

"مولانا ہم پھر عرض کرتے ہیں کہ آپ خواہ مخواہ خودکشی کر رہے ہیں"۔

ہم نے نحیف آواز میں کہا۔ "میری موت خودکشی نہیں بلکہ شہادت کا درجہ پائیگی اور میں قیامت تک اعتبار ہی بدپرہیزوں کا کشتہ کہلاؤں گا"۔

دوسرے صاحب نے فرمایا۔ "آپنے یقیناً یہ تحریک نہایت ٹھوس اور مبارک اُٹھائی ہے مگر آپ کا برت بہت قبل از وقت ہے"۔

ہم نے اپنے کو اور بھی کمزور بنا کر کہا :۔

"میں اپنی قربانی سے اس تحریک کو وہ کامیابی دیدوں گا جو

بغیر قربانی کے سو سال میں بھی ممکن نہ ہو گی"۔

ایک پنڈت جی کرم فرمانے فرمایا:۔

"آپ برت چھوڑ کر پہلے مسلمان بھائیوں کو اس پر تیار کریں کہ وہ ان تمام باتوں کو چھوڑ دیں جو چھوت چھات کا باعث ہیں مثلاً گاؤکشی وغیرہ اور اسکے بعد ہندوؤں سے مطالبہ کریں کہ وہ مسلمانوں سے چھوت نہ کریں لیکن آپ تو ان تدبیروں کے بجائے برت رکھے ہوئے ہیں اور قبل از وقت جان دئیے دیتے ہیں"۔

ہم نے پنڈت جی کو اشارہ سے قریب بلا کر آہستہ سے کہا:۔

"میں نے اسی رواداری کے پیدا کرنے کیلئے جان کی بازی لگائی ہے آپ کو میرے برت کی پروا نہ کرنا چاہیئے بلکہ مجھ کو برت رکھنے دیں اور جو اصلاحات آپ کر سکتے ہیں وہ کریں"۔

آج بھی ہمارے ناصحان مشفق کو ناکام جانا پڑا اور اب تو ہر طرف یہی دھوم تھی کہ ہم برت رکھ کر جان دینے پر تلے ہوئے ہیں تمام قصبہ کے بڑے بڑے لوگ آتے تھے امکانی اثر ڈالتے تھے اور ناکام ہو کر واپس چلے جاتے تھے ادھر ہمارا یہ حال تھا رات کو بلی بنکر تمام نعمت خانہ کا دودھ اور دوسری

چیزیں صاف کرتے تھے اور دن کو ادھر اُدھر آنکھ بچا کر کچھ ناشتہ کر لیتے تھے لیکن اس تمام آرٹ کا کمال یہ تھا کہ روز بروز اپنے کو زیادہ کمزور زیادہ خطرہ سے نزدیک اور زیادہ مہلک حالت میں ثابت کرتے تھے اور واقعی ہمارے اس آرٹ کا خاطر خواہ اثر ہو رہا تھا ہماری شہرت اب قصبہ سے باہر تمام اطراف میں تھی یہاں تک کہ ہمارے برت کے ساتویں ہی روز اخبارات میں بھی ہماری دھوم مچ گئی، ہندو اخبارات نے ہماری شدید ترین مخالفت شروع کر دی مسلم اخبارات نے ہم کو یہ کہہ کر بیوقوف بنانا شروع کر دیا کہ ہم نے ہندوؤں کا احتراز اور اجتناب دیکھتے ہوئے بھی یہ عزم کیوں اور کس اُمید پر کیا ہے بہر حال ہمارے ہر طرف چرچے ہونے لگے اور دُور دُور سے لوگ ہماری زیارت کو آنے لگے یہاں تک کہ بعض انگریزی اخبارات نے تو اپنے نمائندے بھی ہمارا بیان حاصل کرنے کو ہمارے پاس بھیجے اور بعض اخبارات کے نمائندے ہماری تصویریں کھینچ کر لے گئے جو انگریزی اخبارات میں بھی شائع ہوئیں اور پھر انہی سے مسخ شدہ قلمی تصاویر اُردو اور ہندی اخبارات میں شائع ہوئیں اور اب ہمارے پاس تمام اطراف ہند سے بڑے بڑے رہنماؤں، بڑے مدبروں اور بڑے بڑے سیاست دانوں کے

خطوط آنے لگے جن میں سے ہمارے مخالفین بھی تھے اور ہمارے
موافقین بھی یہاں تک کہ ہمارے برت کو سولھواں دن ہوگیا
بلّی کو لاگو سمجھ کر پہلے تو نعمت خانہ کو مقفل کیا گیا لیکن جب اسطرح
بھی کام نہ چلا اور دودھ کے علاوہ دوسری اشیا خوردنی غائب ہونے
لگیں تو یہ ترکیب ہونے لگی کہ تمام کھانے پینے کی چیزوں کو چھینکے پر ٹانگ دیا
جاتا تھا لیکن بعد میں ثابت ہوا کہ بلّی تو خواہ مخواہ بدنام ہے یہ تو کچھ آسیبی
خلل معلوم ہوتا ہے کہ چھینکا زمین سے بہت اونچا چھت میں معلق ٹنگا
ہوا ہے اور اسپر رکھی ہوئی چیزیں غائب ہیں، حد تو یہ ہے دودھ، بالائی، گوشت،
حلوہ، مٹھائی وغیرہ کے علاوہ انڈے تک غائب ہوجاتے ہیں معلوم نہیں
زمین کھا جاتی ہے یا آسمان نگل جاتا ہے پھر لطف یہ کہ جب حلوہ میں
زہریلی چیزیں ملادیجاتی ہیں تو وہ حلوا چھوا بھی نہیں جاتا، آخرکار سب نے
یہ طے کیا کہ ان تمام کھانے پینے کی چیزوں کو باورچی کے پلنگ کے
پاس رکھا جائے اور باورچی بندوق لیکر رات بھر بنا پڑا رہے جب
چور آئے تو وہ اس کو زندہ پکڑ لے یا بندوق کا نشانہ بناوے بہرحال
کسی طرح تو یہ روز روز کی پریشانی ختم ہو۔

جس روز یہ رزولیوشن متفقہ طور پر منظور ہوا ہے اور تمام کھانے پینے کی چیزیں مسلح باورچی کے پہرہ میں رکھی گئی ہیں اسدن ہم کو خود اپنی طرف سے ناامیدی ہو گئی اور ہم نے طے کر لیا کہ یا تو اب ہمارا برت خطرہ میں ہے ورنہ ہم خود خطرے سے نکل نہ سکیں گے جس رات کے انتظار میں تمام دن برت رکھا کرتے تھے وہ رات خود ہمارے گھر والوں نے اسقدر خوفناک اور ہمت شکن بنادی تھی مگر خدا کی قدرت دیکھئے کہ نصف شب کی خواب آور خنک ہوا نے باورچی صاحب کو مع بندوق کے واقعی سُلادیا اور ہم کو موقع مل گیا کہ ہم آسانی کے ساتھ پڈنگ، حلوہ اور کباب وغیرہ سے روزہ افطار کرلیں چنانچہ ہم نہایت احتیاط کیساتھ باورچی کے پلنگ کے نیچے گئے اور اپنا کام تقریباً تکمیل تک پہنچا ہی دیا تھا کہ خدا جانے کس طرح دیگچی ہاتھ سے چھوٹ پڑی اور اسی کیساتھ باورچی نے بندوق کا گھوڑا بھی دبا دیا اب ہمارے منھ میں کباب کیا تھے گویا سانپ کے منھ میں چھچھوندر تھی کہ نہ اُگلا جائے نہ نگلا جائے ــــــــــ دوسرے دن صبح تڑکے ہی ہم اپنے قصبہ سے روانہ ہو کر لکھنؤ پہونچ گئے اور اب اس خوف سے اخبار نہیں دیکھتے کہ خدا جانے کس جدید تحریک کے سلسلہ میں برت رکھنے کو دل چاہے۔

اصلاح سخن

برادر محترم مولانا ارشد تھانوی کی ہمیشہ سے یہ عادت ہے کہ ان کو ڈاک آنے کے وقت تک قبض رہتا ہے اور جہاں ڈاک آئی بس وہ تازہ اخبارات ایک ہاتھ میں اور لوٹا دوسرے میں لئے ہوئے نہایت تیزی کیساتھ رفع حاجت کیلئے تشریف لیجاتے ہیں جہاں نہایت اطمینان کیساتھ تازہ ترین خبریں پڑھتے ہیں اور لگے ہاتھ قبض کی شکایت بھی رفع ہو جاتی ہے۔ ہم میں خدانخواستہ یہ بدبودار ادبی ذوق تو نہیں ہے لیکن پھر بھی ارشد صاحب کے سگے چچازاد بھائی ہیں کچھ نہ کچھ اثر تو آنا ہی چاہیئے، چنانچہ ہمارے دماغ میں کچھ ایسی ادبی خشکی پیدا ہو گئی ہے کہ چاہے دن بھر اسی ادبیت کے پیچھے مرے ہوں لیکن رات کو بغیر کوئی نہ کوئی کتاب پڑھے نیند ہی نہیں آتی اور اگر یہ عادت نہ ہو تو سمجھ لیجئے کہ ہم کو لکھنے سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ کبھی کچھ پڑھیں بھی قصہ مختصر یہ کہ مزاج شناس بیوی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے چنانچہ رات کو جب ہم بستر پر جاتے ہیں تو چارپائی سے ملی ہوئی ایک معصوم میز پر چند

نئے رسالے کچھ تازہ اخبارات اور ایک آدھ کتاب لکھی ہوئی ضرور ملتی ہے
اور ہم ان میں سے کسی نہ کسی کو لیکر تھوڑی دیر جھک ضرور مارتے ہیں اور
پھر کتاب نہایت آرام کیساتھ ہمارے سینہ پر لیٹ کر سو جاتی ہے

ایک رات بستر پر لیٹ کر جو ہم نے اس شیر خوار میز پر ہاتھ مارا تو
جو چیز ہمارے ہاتھ لگی تھی اسکا نام "اصلاح سخن" تھا۔ بس کچھ نہ پوچھئے
اس اصلاح سخن نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا یہ ہم پہلے ہی عرض کر چکے
ہیں کہ ہم نیند آنے کیلئے کتاب پڑھتے ہیں لیکن اس اصلاح سخن نے ہماری
نیند ایسی حرام کی کہ بس عین اُسوقت جب مُرغِ سحر "ککڑوں کوں" فرما رہا
تھا یہ اصلاح سخن صاحبہ "تمت بالخیر" پر پہنچیں اور ہم کو اسکا علم ہوا کہ
ہمنے تمام رات شب فرقت کی طرح آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹی ہے
بلکہ اب تو ہماری یہ رائے ہوگئی ہے کہ ہجران نصیب عشاق جو شب فرقت
کے تصور سے بھی تھرا اُٹھتے ہیں ایک نسخہ اصلاح سخن کا منگا کر استعمال
کریں انشاءاللہ تیر بہدف ثابت ہوگا آزمائش شرط ہے ع

پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

قیمت ۱۲ ؍ محصولڈاک بذمہ خریدار، پیکنگ مفت، ملنے کا پتہ، منشی عبدالعلی صاحب

شوقؔ سندیلوی، سندیلہ ضلع ہردوئی - یو-پی -

یہ کتاب دراصل سندیلہ کے ایک شاعر منشی عبدالعلی صاحب شوقؔ کا "سولہ غزلی" دیوان ہے لیکن نیرنگ خیال کے سائز سے بھی زیادہ چھوٹے سائز کے ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے، آپ کہیں گے کہ یہ سولہ غزلیں کس قلم سے لکھی گئی ہیں جو ۲۲۴ صفحات کی ضرورت پیش آئی، اسکا جواب یہ ہے کہ مصنف نے کچھ ایسی ترکیب رکھی ہے کہ اپنے دیوان کے ساتھ ساتھ ہندوستان بھر کے تمام مشاہیر شعراء کے دواوین اس مجموعہ میں پیش کر دئے ہیں لیکن ہمارے اس جواب سے اصل سوال بجائے حل ہونے کے اور بھی زیادہ پیچیدہ ہوگیا لہٰذا اس کو تو سردست ہیں پر چھوڑیے پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ منشی عبدالعلی صاحب شوقؔ کون بزرگ ہیں، ان کا حدود اربعہ کیا ہے اور ہم کیوں آج ان کا تعارف کرانے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں قصہ دراصل یہ ہے کہ آپ کا نام ہے عبدالعلی، منشی یونہی اعزازی طور پر لکھ دیا جاتا ہے، جیسے لوگ ہم کو حضرت یا مولانا لکھ دیتے ہیں حالانکہ ہم ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں، ہاں تو عبدالعلی ہوا نام اور منشی ہوئی اعزازی ڈگری باقی رہ گیا شوقؔ وہ آپکا تخلص ہے سندیلہ ضلع ہردوئی کے

رہنے والے ہیں لہٰذا اب آپ مکمل طور پر ہوئے منشی عبدالعلی شوق سندیلوی چونکہ آپ کے اسم مبارک کیساتھ تخلص مبارک بھی ہے لہٰذا ظاہر ہے کہ آپ شاعر بھی ضرور ہوں گے چنانچہ آپ واقعی شاعر ہیں اور ایسے شاعر کہ اپنی قسم کے ہندوستان میں پہلے بلکہ اگر تحقیق کیجائے تو شاید دنیا میں یکتا نکلیں۔ اس یکتائی کا سبب آپ کی شاگردی کے قصہ سے پیدا ہوتا ہے چنانچہ شاگردی کے معاملہ میں روایات ذرا مختلف ہیں کہ آپ کس کے شاگرد ہیں بلکہ ہم تو یہ سمجھے ہیں کہ اس معاملہ میں آپ لمیٹڈ کمپنی کے قسم کے شاعر ہیں اور آپ کے اُستاد ہونے کا شرف ہندوستان کے تقریباً تمام مشاہیر شعراء میں بحصّہ مساوی تقسیم ہوگیا ہے تاکہ کسی کو اس معاملہ میں شکایت نہ رہے اور سب اپنی اپنی جگہ پر اپنے اس شاگرد رشید سے خوش رہیں۔

اللہ جانے اور اللہ کا حبیب جانے کہ ان حضرت کو شاعری کے ساتھ ساتھ یہ کیا سوجھی تھی کہ تمام ہندوستان کے شاعروں کو اُستاد بنا بیٹھے اور سندیلہ میں بیٹھ کر ہندوستان بھر کے شعراء سے اصلاح لینا شروع کردی ایک غزل کہتے تھے اُس کی پچاسوں نقلیں کرتے تھے اور ایک ایک نقل تمام شعرائے ہند کے نام روانہ کردی جاتی تھی اور ہر جگہ سے اصلاح شدہ

غزل آپ کے پاس گھر بیٹھے آجاتی تھی اب معلوم نہیں کہ آپ کس کی اصلاح کو مانتے تھے اور کس کی اصلاح کو رد کر دیتے تھے بہر حال واقعہ یہ ہے کہ آپ کی ہر غزل اس طرح تمام شعراء کو بھیجی جاتی تھی جس طرح اڈیٹر صاحب نیرنگ خیال اپنا رسالہ شائع ہوتے ہی تمام خریداروں کو بھیجتے ہوں گے، یہ سلسلہ عرصہ تک قائم رہا اور یہ ہرجائی شاگرد خدا معلوم کن کن اُستادوں سے شرف تلمذ حاصل کرتا رہا، چنانچہ اصلاح سخن کے دیکھنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر آپ کے اُستادوں کے نام گنائے جائیں یعنی آپ کا نام معہ استاد کے نام کے لکھا جائے تو اس طرح لکھا جائے گا۔

منشی عبدالعلی صاحب شوق سندیلوی تلمیذ جناب احسن، آرزو، آزاد، اطہر، افضل، اقبال، اکبر، باقی، بزم، بیباک، بیخود، بیخود نمبر۲، ثاقب، جگر، جلیل، دل، دلگیر، رنجور، ریاض، زہری، سائل، شاد، شہرت، شفق، شوق، شوکت، صفی، عتیق، عزیز، فانی، کوثر، مائل، محشر، مضطر، مومن، ناطق، نظم، نواب، نوح، نیاز، وحشت وغیرہ۔

آپ اس فہرست کو دیکھ کر مبالغہ سمجھیں گے لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اُستادوں کی یہ فوج ظفر موج واقعی ایک ہی شاگرد کی ہے اور

شوق صاحب سندیلوی نے اپنی سولہ غزلوں پر ان سب صاحبان سے اصلاح لی ہے، اب آپ اندازہ کیجئے کہ جس ایک شاگرد کے بیالیس ۴۲ یعنی چالیس اوپر دو اُستاد ہوں گے وہ کیا چیز ہوگا اور اس کو اگر ہم اپنی قسم کا پہلا شاعر کہہ رہے ہیں تو کیا غلط کہہ رہے ہیں۔

اب اُن بیالیس اُستادوں کے تنہا شاگرد صاحب کی سعادت مندی ملاحظہ فرمائیے کہ آپ نے ان تمام اصلاحوں کو اپنے تمام اُستادوں کے نام سے یکجا کر کے شائع فرما دیا ہے اور اسی شرارت کا نام اصلاح سخن ہے جسکے متعلق ہم نے یہ سب کچھ لکھا ہے، خیر اصلاحوں تک تو کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن اس ہونہار شاگرد نے تو یہ حرکت بھی کی ہے کہ تمام اساتذہ کے خطوط بھی شائع کر دئیے ہیں ظاہر ہے کہ وہ خطوط بغرض اشاعت نہ تھے اور ان کو استاد و شاگرد کے درمیان راز و نیاز کی حیثیت حاصل تھی لہذا ان میں سے بعض میں شاگردی کی مٹھائی کا مطالبہ ہے، بعض میں سندیلہ کے مشہور و معروف لڈوؤں کیلئے حسن طلب ہے بعض میں نجی طور پر کچھ حق اُستادی بصورت سیم و زر طلب کیا گیا ہے، بعض میں کچھ گھریلو باتیں ہیں۔

نیاز صاحب نے اپنے سعادت آثار شاگرد کو مشورہ دیا ہے کہ پہلے کہیں

دل لگا کر پھر شاعری کر د، شوق قدوائی مرحوم اس پر مصر ہیں کہ اُستاد اور شاگرد کا تخلص ایک نہ ہونا چاہیئے، تخلص بدلو مختصر یہ کہ سب نے ان حضرت کو اپنا سمجھ کر جو کچھ لکھا ہے بے تکلفی سے لکھا ہے لیکن آپ نے یہ حرکت فرمائی کہ تمام خطوط کو لفظ بہ لفظ اصلاح سخن میں شائع کر دیا، ظاہر ہے کہ اس شرارت سے کتاب کی دلچسپیوں میں اضافہ ہو گیا لیکن ان دلچسپیوں کو ان اُستادوں کے دل سے پوچھے جنھوں نے شاگردی کی مٹھائی یا سندیلہ کے لڈو مانگے تھے، واللہ اگر ہم ہوتے تو ان شاگرد رشید پر بغیر مقدمہ چلائے نہ مانتے۔

اس کتاب کا وہ حصہ بس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے جس میں تمام اُستادوں کی اصلاحیں اس طرح جمع کی گئی ہیں کہ ہر شعر او ہر شعر کا ہر مصرعہ کسی مجلس قانون ساز کا سوال معلوم ہوتا ہے جس پر تمام ممبران ایوان کی علیحدہ علیحدہ ترمیمات پیش کی گئی ہیں، اتفاق کرنے والے ووٹ ایک طرف ہیں اور اختلاف کرنے والے ایک طرف، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رزولیوشن منظور ہوا یا نامنظور۔ دل تو چاہتا تھا کہ تمام اصلاحیں پیش کر دیں لیکن ڈر یہ ہے کہ نیرنگ خیال کا بقرعید نمبر نکل رہا ہے اس ایک مضمون کی وجہ سے باقی تمام مضامین کی قربانی ہو جائیگی لیکن ایک

غزل تو ہم ضرور پیش کریں گے ملاحظہ فرمائیے اصل مطلع یہ ہے۔

یہ دل کے بہلنے کی تدبیر نظر آئی

بند آنکھ جو کی تیری تصویر نظر آئی

اب اصلاحوں کی ریل پیل ملاحظہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی

غور فرمائیے کہ یہ غریب مطلع کتنی قلابازیاں کھاتا ہے، سب سے پہلی اصلاح

جناب آرزو لکھنوی کی ہے، آپ فرماتے ہیں۔

"یہ تغیر اصلاح کوئی خرابی نہیں بلکہ ایک منزل ہے ترقی فکر کی"۔

اس نثر کے بعد پہلے مصرعہ کو یوں اور ہال کیا ؎

کیا سو کے پلٹ جاتے تقدیر نظر آئی

اور دوسرا مصرعہ بجنسہ رہنے دیا۔ خیام الہند حضرت ریاض خیرآبادی نے

پہلے مصرعہ کو اس طرح بنایا ؎

کیا دل کے بہلنے کی تدبیر نظر آئی

اور دوسرا مصرعہ بجنسہ رہنے دیا لیکن لسان الہند مولانا عزیز لکھنوی

کی رائے میں پہلا مصرعہ صحیح تھا اور دوسرے میں ترمیم کی ضرورت تھی

چنانچہ دوسرے مصرعہ کی یہ شکل بنائی گئی ؎

جب غور کیا تیری تصویر نظر آئی

مولانا نیاز فتحپوری نے پہلے مصرعہ میں ایسی اصلاح فرمائی کہ لفظ بہ لفظ حضرت ریاض سے اس بڑھاپے میں توارد ہو کر رہ گیا۔

حضرات اطہر و جگر نے مطلع پر ص بنا دیا یعنی پاس کر کے لیسنس دیدیا گیا کہ جس طرح چاہو اس مطلع کو کام میں لاؤ بالکل جائز ہے اور حضرات بیخود دہلوی، بیخود موہانی، جلیل، دل، شوق، صفی، فانی اور وحشت نے بغیر کسی ترمیم کے یوں ہی چھوڑ دیا یہ بھی ایک قسم کا ص ہی سمجھئے۔

دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔

بیمار نے دنیا سے جانے میں بھی عجلت کی

جب آپ کے آنے میں تاخیر نظر آئی

اس شعر کو جناب ریاض اور جناب جلیل نے تو ص بنا کر پاس کر دیا اور حضرت بیخود دہلوی، قتیل، فانی اور صفی نے بغیر کسی کاٹ چھانٹ کے یونہی رہنے دیا، باقی سب نے پہلے مصرعہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی چنانچہ حضرت آرزو نے اس مصرعہ کو یوں کر دیا ؎

بیمار نے دنیا سے جانے میں بھی جلدی کی

عجلت اور جلدی میں بظاہر کوئی فرق نہیں لیکن وہی خالص اور نخالص اُردو کا فرق ہے جس کا حضرت آرزو سوتے جاگتے ہر وقت خیال رکھتے ہیں اور خواب بھی خالص اُردو میں دیکھتے ہیں۔

خیر یہ تو ہمارا دخل در معقولات تھا، اب دیکھئے کہ یہی مضمون کیا کیا رنگ بدلتا ہے اور پھر وہی رہتا ہے جو بغیر رنگ بدلے تھا۔

یعنی شوق صاحب کا اصل مصرعہ۔

اطہر صاحب فرماتے ہیں۔

بیمار نے دنیا سے تعجیل کی جانے میں

معلوم ہوا کہ عجلت اور جلدی کے علاوہ ایک ہم معنی لفظ اور بھی رہ گیا تھا جس کو تعجیل کہتے ہیں۔

حضرت بیخود موہانی فرماتے ہیں ؏

بیمار نے جلدی کی دنیا سے گزرنے کی

دل صاحب نے ترمیم فرمائی ؏

بیمار نے دنیا سے اُٹھ جانے میں عجلت کی

شوق صاحب نے "بھی" کو حشو قرار دیتے ہوئے مصرعہ فرمایا ؏

"بیمار کو دنیا سے جانے کی ہوئی عجلت"

نیاز صاحب نے اصلاح دی ؎

"بیمار محبت نے جانے میں بھی عجلت کی"

یہ اچھا کیا "بیمار محبت" کہہ کر بیماری کی نوعیت پر روشنی ڈال دی ورنہ یہ سمجھا جاتا کہ خدا جانے دق کا مریض تھا یا ہیضہ کا۔

حضرت وحشت نے فرمایا ع

"کچھ جلد قضا پہنچی جو میں نے بھی عجلت کی"

اور واقعی جب آپ خود ہی بیمار ہیں تو یہ گول گول باتیں کہنے سے کیا فائدہ، صاف کیوں نہیں کہتے کہ جو کچھ کیا میں نے کیا۔

تیسرا شعر ہے

یہ جذبِ تصور ہے یہ عالمِ محویت
ہر چیز میں تیری ہی تصویر نظر آئی

اس شعر کو حضرات جگر، عزیز اور وحشت نے تو ص بنا کر بالکل صحیح قرار دیا لیکن حضرات بیخود دہلوی، جلیل، ریاض، شوق اور صفی نے نہ غلط کہا اور نہ صحیح بس یونہی ٹال دیا۔ یعنی بغیر کسی ترمیم کے رہنے دیا۔ اب

مندرجہ ذیل اصلاحیں ملاحظہ ہوں۔

آرزوؔ صاحب نے دوسرا مصرعہ تو بجنسہ رہنے دیا لیکن پہلے مصرعہ کو اس طرح بنایا ع

اک محوِ تصور نے دیکھا بھی تو کیا دیکھا

اطہرؔ صاحب نے بھی اسی مصرعہ کی مرمت کی ع

یہ عالمِ محویت یہ جذبِ تصور ہے

بیخودؔ صاحب موہانی نے پورا شعر ہی گویا پھر سے فرما دیا جو یہ ہے

اک مستِ تصور کی اللہ رے محویت

ہر چیز میں جب دیکھی تصویر نظر آئی

دلؔ صاحب نے پہلے مصرعہ کو اس طرح فٹ کیا۔

یہ لطفِ تصور ہے یا عالمِ محویت

اب دیکھئے کہ "جذب" اور "لطف" کے ردوبدل سے کتنا عظیم الشان انقلاب واقع ہوا ہے۔

فانیؔ صاحب فرماتے ہیں۔ ع

یہ جوشِ تصور ہے یہ عالمِ محویت

اب گویا تین لفظ ایک جگہ کے امیدوار ہیں، جذب، لطف اور

جوش تینوں اس مصرعہ میں آ نہیں سکتے ورنہ اچھے تینوں ہیں۔

نیاز صاحب کی رائے میں "آئی" سے آتی ہے کا مفہوم پیدا ہوتا ہے

لہذا انھوں نے یہ غلط فہمی دور کرنے کیلئے پورا شعر ہی بدل دیا۔

کیا جذب تصور تھا کیا عالم محویت

ہر شے میں مجھے تیری تصویر نظر آئی

اگر شعر اچھا ہے تو اس کی داد شوق صاحب کو نہیں نیاز صاحب کو

دیجئے۔

چوتھا شعر ہے ؎

اے جوش بہار گل اب خیر نہیں اپنی

دم بھر جو پلک جھپکی زنجیر نظر آئی

اس شعر کے متعلق آرزو صاحب فرماتے ہیں کہ "یا یہ شعر اچھا نہیں ہے

یا میرا دماغ اس کی خوبی سمجھنے سے قاصر ہے۔

میری رائے میں اسکا فیصلہ ناظرین پر چھوڑ دیا جائے لیکن ناظرین سے

ہماری استدعا ہے کہ لگی لپٹی سے کام نہ لیجئے گا بلکہ خدا لگتی کہیئے گا۔

اطہر صاحب نے دوسرے مصرعہ کو ٹھیک اور پہلے کو غلط قرار دیکر اصلاح دی ہے۔ ع

اس فصلِ بہاری میں اب خیر نہیں اپنی

اس سے کم از کم یہ معلوم ہوگیا کہ امسال والی فصلِ بہاری کا ذکر ہے۔

حضرت بیخود نے بھی پہلے مصرعہ کو ٹھیک کیا ہے۔

اب خیر کہاں اپنی اے موجۂ بوئے گل

"موجۂ بوئے گل" سے البتہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی قابل آدمی کا شعر ہے۔

دل صاحب نے پورے شعر کو درست فرمایا ہے۔

یہ جوشِ بہارِ گل پیغام ہے زنداں کا
ہر موجِ ہوا ہم کو زنجیر نظر آئی

دیکھئے شوق صاحب نے زنجیر تو کہہ دی زنداں کہنا ہی بھول گئے۔

حضرت ریاض نے بھی پورے شعر پر اصلاح دی ہے۔

گھر آکے یہ ہاتھ آیا زنداں مرے ساتھ آیا جو موجِ ہوا آئی زنجیر نظر آئی

سبحان اللہ، مذاق نہیں واقعی سبحان اللہ۔

مولانا عزیز نے دوسرے مصرعہ میں ترمیم کی ہے۔

"دم بھر کو پاک جھپکی زنجیر نظر آئی"

صرف "کو" اور "جو" کا فرق ہے۔

فانی صاحب نے پہلے مصرعہ میں ایک لفظ بدلا ہے۔

"اے موج بہار گل اب خیر نہیں اپنی"

نیاز صاحب نے پورا شعر صحیح فرمایا۔

"وہ جوش بہار گل ہے یاد مجھے اب تک
جب آنکھ ذرا جھپکی زنجیر نظر آئی"

اور پھر یہ فرمایا ہے کہ "آئی" سے "آتی ہے" کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔
لہذا ردو بدل ضروری تھا۔

حضرات جگر، عزیز اور وحشت نے ص بنا کر پاسپورٹ دیدیا اور حضرات بیخود دہلوی، جلیل، شوق اور صفی نے بغیر ص بنائے یونہی رہنے دیا ہے۔

پانچواں شعر ملاحظہ ہو ـ

"کہتی ہے یہ راز انکی آنکھوں کی پریشانی
بیمار کی حالت کچھ تغییر نظر آئی"

اس شعر کو صرف اطہر صاحب نے ص کی سند عطا کی ہے اور حضرات بیخود دہلوی، صفی اور وحشت نے بغیر کسی ترمیم کے رہنے دیا باقی سب نے کچھ نہ کچھ قطع و برید کی ہے۔

آرزو صاحب پہلے مصرعہ کو یوں بدلتے ہیں ؎
"کہتا ہے یہ راز اُن کی آنکھوں کا بدل جانا"
تانیث کو تذکیر کس خوبی سے بنایا ہے۔

جناب بیخود موہانی نے پورا شعر یوں سجایا ہے
کہتے ہیں یہ اک اک سے قاتل کے ترے تیور
مجروح کی حالت کچھ تغییر نظر آئی"
"کی حالت کچھ تغییر نظر آئی" کے علاوہ سب غائب۔

جگر صاحب نے پہلا مصرعہ بدل دیا ؎
کہتی ہے یہ راز انکی آنکھو نکی نمی سب سے
بغیر "نمی" "کہے ہوئے" "سب سے" اس مصرعہ میں لانا ممکن نہ تھا اُستاد السلطان

حضرت جلیل نے پہلے مصرعہ کو یوں کاٹا ؎

کہتی ہے یہ در پردہ ان آنکھوں کی حیرانی

آنکھوں کیلئے "پردہ بھی آگیا اور" ان" گویا گھاتے ہیں۔

دل صاحب پہلا مصرعہ فرماتے ہیں۔ ؎

ظاہر ہے یہ راز اُن کے انداز پریشاں سے

نہ آنکھیں رہیں گی نہ اُن کا جھگڑا ہوگا، انداز سب سے اچھا۔

ریاض صاحب نے کہا "تغیر" اچھا نہیں اور پورے شعر کو بقر عید کا بکرا بنا ڈالا لیکن اسکے بدلے یہ شعر دیدیا تاکہ حساب برابر رہے ؎

صدقے ترے ابرو کے جنبش ترے ابرو کی

چلتی ہوئی ہم کو تو شمشیر نظر آئی"

شوق صاحب نے بھی پورے شعر کو "بسم اللہ اللہ اکبر" کہہ کر دوسرا شعر فرما دیا ؎

کیا غمزدہ حالت ہے آج اُس نے نہ پہچانا

ایسی مری صورت میں تغیر نظر آئی

عزیز صاحب نے پہلے مصرعہ کو بدل دیا۔ ؎

"کہتی ہے یہ راز اُنکے چہرے کی پریشانی"

لیجئے چہرہ ایک ایسا لفظ ہے جس میں دونوں آنکھیں بھی شامل ہیں۔ فانی صاحب نے خدا جانے اس شعر کو کیا کیا لیکن ایک دوسرا شعر لکھ دیا تاکہ جگہ خالی نہ رہے ؎

"کچھ رازِ ندامت اب ان آنکھوں سے کھلتا ہے
بیمار کی حالت کیا تغییر نظر آئی"

نیاز صاحب نے صاف صاف کہہ دیا کہ بھائی "یہ شعر نکال ڈالئے، حالت تغییر نہیں ہوتی بلکہ حالت میں تغیّر ہوتا ہے" بات یہ بھی پتہ کی ہے۔

آخری شعر ہے ؎

"ظالم کی محبت تھی تمہید جفا یعنی
وہ خواب تھا جس کی اب تعبیر نظر آئی"

اس شعر کو حضرات جگر، ریاض اور عزیز نے توص بنا کر پاس کر دیا باقی حضرات بیخود دہلوی، جناب جلیل، حضرت دل، جناب شوق، مولانا صفی، حضرت فانی اور جناب وحشت نے محتاج اصلاح نہ سمجھ کر یونہی

رہنے دیا ہے لیکن چند اصلاحیں بھی ہیں جن کا ہونا برحق تھا۔

آرزو صاحب نے دوسرا مصرعہ بدل دیا۔ ع

اس خواب کی آج اُلٹی تعبیر نظر آئی

"اُلٹی" کہنا ضروری تھا اس لئے کہ اکثر تعبیر بھی وہی نظر آتی ہے جو خواب نظر آتا ہے۔

حضرت اطہر نے پہلے مصرعہ میں رد و بدل کیا ہے۔ ع

اُلفت تھی ستمگر کی تمہید جفا یعنی

"محبت و اُلفت" اور "ظالم و ستمگر" کا فرق کچھ معمولی نہیں ہوتا۔

جناب نہجو د موہانی پہلے مصرعہ کو یوں فرماتے ہیں۔ ع

"ظالم کی وفائیں تھیں تمہید جفا یعنی"

واقعی بغیر وفا کے جفا کا ذکر کرنا بے جوڑ سی بات ہے۔

نیاز صاحب نے صرف ایک لفظ دوسرے مصرعہ میں بدلا ہے۔

وہ خواب تھا جس کی یہ تعبیر نظر آئی

مقطع ہے ؎

اے شوق مبارک ہو پوچھا تجھے آج اس نے

ضبط غم اُلفت کی تاثیر نظر آئی

اس مقطع کو حضرات اطہر، جگر، ریاضؔ اور عزیز نے ص بنا کر بالکل صحیح قرار دیا ہے اور حضرات بیخود دہلوی، جلیل، شوق، صفی، فانی اور وحشت نے نہ ص بنایا ہے نہ کاٹا ہے اس کا مطلب یہ کہ غنیمت سمجھا ہے اصلاحوں میں حضرات آرزو، بیخود، موہانی اور دل نے پہلا مصرعہ اس طرح بدلا ہے کہ تینوں ہم آواز ہو گئے ہیں یعنی تینوں میں اصلاحی توارد واقع ہو گیا ہے، ان تینوں شعرائے کرام کا مصرعہ ہے۔

اے شوق مبارک ہو پوچھا تو مزاج اُس نے

جناب ریاضؔ نے پورا شعر بدل دیا ہے، پہلے مصرعہ میں تو آپ بھی توارد سے بال بال بچے لیکن دوسرے مصرعہ میں صرف ایک لفظ کے تغیر نے شعر کو آسمان پر پہنچا دیا ؎

"اے شوق مبارک ہو پوچھا تو تجھے اُس نے
بارے غم الفت کی تاثیر نظر آئی"

غزل بھی ختم اور اصلاحیں بھی ختم، اب حضرت ریاضؔ اور حضرت اطہر کا دریائے سخاوت جوش میں آتا ہے، چنانچہ اطہر صاحب اپنے شاگرد رشید کو دو شعر اپنی جیب خاص سے مرحمت فرماتے ہیں ؎

ہر پھول میں تیری ہی بو مجھ کو دکھائی دی
ہر شمع میں تیری ہی تنویر نظر آئی

اس شعر میں "بو دکھائی دینے" پر ہم کو ذرا شک ہے لہٰذا ہم یہ ترمیم پیش کرتے ہیں۔

ہر پھول میں تیری ہی بو مجھ کو سنگھائی دی

اب آپ کہیں گے "سنگھائی دی" غلط ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ بو دکھائی دینا کب صحیح ہے؟ خیر یہ ایک دوسرا مبحث ہے۔

دوسرا شعر ملاحظہ ہو

محشر کدۂ دل میں انبوہ تمنا سے
میدان قیامت کی تصویر نظر آئی

معلوم نہیں اس شعر کو دینے ہی کی کیا ضرورت تھی؟

حضرت ریاضؔ نے بھی دو اشعار بطور تبرک اپنے ہونہار شاگرد کو دئے ہیں کہ لیتا جا، بال بچوں کے کام آئیں گے ایک شعر تو وہی جسکی ہم اوپر کہیں صحیح معنوں میں تعریف کر آئے ہیں یعنی

گھر آکے یہ ہاتھ آیا زنداں سے ساتھ آیا جو موج ہوا آئی زنجیر نظر آئی

اور دوسرا شعر بھی اوپر درج کر چکے ہیں ؎

صدقے ترے ابرو کے جنبش ترے ابرو کی

چلتی ہوئی ہم کو تو شمشیر نظر آئی

اب سب کچھ لکھنے کے بعد ہم پوچھتے ہیں کہ "آخر پھر کیا ہوا؟" یعنی اصل غزل ہم کس کو سمجھیں لیکن یہ سوال ایسا ہے جس کا جواب خود شوق صاحب کو بھی معلوم نہیں ورنہ وہ یہ کتاب اصلاح سخن ہی کیوں شائع کرتے اور صرف یہی ایک غزل نہیں پندرہ غزلیں اور اسی طرح فٹ بال بن چکی ہیں جو اصلاح سخن میں موجود ہیں۔

اب بتائیے کہ ایسی کتاب سونے کے وقت اگر کوئی دیکھے تو اُس کو نیند آئے گی یا اور نیند اُڑ جائے گی؟

آبنوس کا کُندا

ہز مجسٹی سلطان مالدیپ کے برادر عزیز اور ہمارے کسی نا گفتہ بہ رشتہ سے برادر مکرم پرنس محمد اسمٰعیل صاحب جنکا وطنی اسم مبارک غالباً تمتقلو ہے۔ اپنے وطن یعنی مالدیپ سے ہمارے لئے از راہ عنایت آبنوس کی ایک قیمتی چھڑی لائے تھے اور ہم نے اس تحفہ کو اس لئے اور بھی بیش قیمت سمجھا تھا کہ اوّل تو یہ ایک دور دراز مقام سے بحر ہند میں تیرتا ہوا اور لنکا سے گزرتا ہوا ہم تک پہنچا تھا، دوسرے اسی کی مدد سے ہم اپنے دشمنوں کو اگر دل چاہے تو اس دنیا سے عدم آباد تک پہنچا سکتے ہیں لیکن اس چھڑی کی وہ تاریخی اہمیت جسکے باعث آج اسکے حالات قلمبند کئے جا رہے ہیں کچھ اور ہی ہے۔

قصہ اصل میں یہ ہے کہ یہ خاکسار جسمانی حیثیت سے باوجود شوکت تھانوی ہونیکے مولانا شوکت علی کی بالکل ضد واقع ہوا ہے بلکہ یہ سمجھ لیجیے کہ اس سلسلہ میں گاندھی جی سے بہت کچھ توارد ہو گیا ہے یعنی یہ سمجھئے کہ ہندوستان کے عظیم الشان انسان مہاتما گاندھی کی طرح یہ خاکسار بھی "نام بڑے اور درشن تھوڑے" کا ڈھائی پسلی والا مجسمہ ہے لیکن آپ کو حیرت ہوگی کہ باوجود اس

نزاکت سے حسن غائب ہے حالانکہ مشہور یہ ہے کہ۔ ع

خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آہی جاتی ہے

لیکن یہاں تو بس آخرالذکر چیز رہ کر رہ گئی اور اوّل الذکر خصوصیت خدا جانے کدھر غائب ہوگئی بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اندھے، کانے، لنگڑے یا لولے قسم کے انسان ہم نہیں ہیں البتہ ہندوستانی ضرور ہیں اور ہم کو بھی سفید فام صاحب لوگ ناک بھول چڑھا کر "کالا آدمی" کہہ سکتے ہیں یہ اور بات ہے کہ خود ہندوستان میں ہمارے اس رنگ کو گندمی یا اور کچھ کہا جائے۔

آپ کہیں گے کہ تذکرہ تو تھا چھڑی کا اور قصہ بیان کرنے لگے خود اپنا اور اپنی صورت کا لیکن آپ مطمئن رہیں کہ ہم نے یہ تذکرہ بھی بے سلسلہ شروع نہیں کیا ہے بلکہ ہماری شکل و صورت کو بھی اس آبنوسی چھڑی سے گہرا تعلق ہے اور وہ تعلق بس اسی طرح پیدا ہوا ہے کہ برادر مکرم پرنس محمد اسمٰعیل صاحب نے اس چھڑی کو ہمارے نام منسوب کرنے کے وقت غالباً ہماری جسمانی حیثیت کو نظر انداز کر دیا تھا اور اُن کے ذہن میں شوکت تھانوی کے بجائے مولانا شوکت علی خادم کعبہ کا خیال تھا یہی وجہ ہے کہ آج ہماری یہ چھڑی ہمارے دست ناز پرور میں بالکل ایسی ہی معلوم ہوتی ہے کہ گویا در دیدی کے سوئمبر میں مچھلی کی آنکھ پھوڑنے

کیلئے وہی تاریخی بہرام گھاٹ کے لٹھے سے بنی ہوئی "الفربہ والطویل" کمان لادے ہوئے چلے جارہے ہیں، یا اپنی جسمانی حالت درست کرنے کیلئے ایک عدد مگدر ہلانے کی مشق شروع کی ہے یا اقتصادی کمزوری کے باعث روئی دھنکنے کا پیشہ اختیار کرلیا ہے مختصر یہ کہ اسی قسم کی مضحکہ خیز مناسبتوں کے علاوہ اس قیمتی چھڑی کو ہم سے یا ہم کو اس محترم و معظم چھڑی سے کوئی مناسبت ہی نہ تھی لیکن اسمیں نہ تو اس چھڑی کا قصور تھا نہ خود ہمارا، اور نہ دراصل پرنس صاحب کی کوئی غلطی تھی بلکہ یہ تو اتفاق ہے اور اگر اسی قسم کے دلچسپ اتفاقات پیش نہ آتے رہیں تو ہم مزاحیہ نگاروں کو اس قسم کا سامان کہاں ملے۔ اس چھڑی کے تاریخی واقعات میں سے صرف ایک واقعہ بطور نمونہ عرض ہے کہ ایک مرتبہ ہم کو ایک صاحب کی دعوت پر معہ اس چھڑی کے سینما جانا پڑا اور عین اسوقت جبکہ ہم اپنے المکلف الخدمت سے سینما کے باہر باتوں میں مشغول تھے اور ہماری چھڑی شاہانہ وقار کے ساتھ خاموش تھی یکایک نہایت نرم و نازک، شیریں اور لوچدار، مترنم اور جنت گوش آواز آئی۔

"آبنوس کا کندا"

ہم نے فوراً پیچھے مڑکر دیکھا تو تین چار کالج کی لڑکیاں کھڑی ہوئی ہم کو اور ہماری چھڑی کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں لیکن ہمارے مڑتے ہی اُن میں سے ہر ایک نے اپنے حسین چہرے دوسری طرف پھیر لئے لیکن اب انکی ہنسی باریک اور سُریلے قہقہوں میں تبدیل ہو چکی تھی اور معلوم ہو رہا تھا کہ کئی خوبصورت صُراحیوں سے بیک وقت شراب اُنڈیلی جا رہی ہے بہر حال ہم نے انکی تفریح میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا اور انکی طرف سے رُخ بدلکر کھڑے ہو گئے اب وہ آزادی کیساتھ ہم پر یا ہماری چھڑی پر تبصرہ کر رہی تھیں لیکن یہ نہیں معلوم کہ کیا اسلئے کہ الفاظ سمجھ میں نہ آتے تھے، البتہ انکی ہنسی بدستور جاری تھی اور وہ یقیناً ہمارے یا ہماری چھڑی کے متعلق تھی، بہر حال ہم خوش تھے کہ اس انجمن ناز میں اگر خود ہم نہیں ہیں تو اس مبارک چھڑی کی بدولت ہمارا ذکر تو ہو ہی رہا ہے۔ ع

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے جو اس محفل میں ہے

یکایک یہ الفاظ پھر ہواہیں ناچتے ہوئے ہمارے کانوں میں آئے:۔

"واقعی آبنوس کا کندا ہے"۔

اور اسکے بعد قہقہوں کے رقص سے بھی معلوم ہو رہا تھا کہ یہ لڑکیاں مارے

ہنسی کے بل کھائے جاتی ہیں، اب ہم کو بھی یہ غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ آخر اسقدر ہنسی کی کون سی بات ہے اور ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ یہ بدتمیز لڑکیاں اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ جس چیز پر وہ ہنس رہی ہیں وہ دراصل ہے کیا، ہمارا ارادہ ہوا کہ ہم اس حسین جھرمٹ میں پہنچکر آبنوس کے موضوع پر ایک تقریر کردیں تاکہ یہ لڑکیاں اپنی بے محل ہنسی پر منفعل ہوں لیکن عین اُسی موقع پر سنیما کی گھنٹی بجی اور ہم کو اس طرف سے خالی الذہن ہوکر تاریک ہال میں مناسب سی نشست کی تلاش میں مصروف ہوجانا پڑا اور اس کے بعد تماشہ دیکھنے میں محو ہوگئے —— پردیسی پریتم میں مس مادھوری کا معصوم ملکوتی حسن ہم کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کئے ہوئے تھا اور ہم اس ڈرامہ کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے جسمیں مادھوری ایلوئنی ہوئی خدا جانے کون سا جادو کررہی تھی کہ یکایک اسکرین پر انٹرول کا مرغا نمودار ہوا اور پھر یکایک تمام ہال برقی روشنی سے جگمگا اُٹھا۔ اب جو ہم نے دیکھا تو وہی شریر لڑکیاں بالکل ہمارے مقابل بیٹھی ہوئی ہیں ہم نے چاہا کہ اُن سے اپنے کو چھپالیں کہ عین اُسی وقت نہایت باریک اور تیز آواز میں کسی نے کہا :-

"ارے آبنوس کا کُندا"

اور ہم اس آواز پر چونک پڑے وہ لڑکیاں بے تحاشا ہنس رہی تھیں اگر سچ پوچھئے تو اب ہم کو انکی ہنسی پر غصہ آرہا تھا اگر وہ خود ہم پر ہنستیں تو چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن ستم تو یہ تھا کہ وہ ہماری بے زبان معزز چھڑی کا مضحکہ اُڑا رہی تھیں ہم غصہ میں پیچ و تاب کھا کر قہر آلود نگاہوں سے ان بدتمیزیوں کو دیکھ رہے تھے کہ ان میں سے ایک لڑکی نے اپنی ایک سہیلی کو جھنجھوڑ کر ہنسی سے نزع کے عالم میں مبتلا ہوتے ہوئے کہا:۔

"دیکھ تو سہی وہ آبنوس کا کُندا ادھر ہی دیکھ رہا ہے"

ہمارا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا اور ادھر ان لڑکیوں نے ہم کو دیکھ کر وہ ہنسی ہنسی ہے کہ خدا کی پناہ مجبوراً ہم کو المکلف الخدمت کی توجہ اسطرف مبذول کرنا پڑی کہ دیکھتے ہو ان بدتمیزوں کو کہ کس طرح مجھ پر اور میری چھڑی پر ہنس رہی ہیں" انھوں نے نہایت سادگی سے کہا۔ "بڑی دیدہ دلیر ہیں انکو تو اس لٹھ سے سہم جانا چاہیئے تھا"۔ ہم کچھ اور کہنا ہی چاہتے تھے کہ آواز آئی "آبنوس کا کُندا غصہ کر رہا ہے"۔ اب ان چھوکریوں کی بدتمیزی ہمارے ضبط سے باہر تھی لہذا ہم غصہ میں اُٹھے اور ہال کے باہر جانے لگے کہ ان لونڈیوں نے پھر کہا۔ "ارے آبنوس کا کُندا تو چلا"۔ اور یہ کہکر وہ قہقہہ بلند کیا کہ بہت سے اور لوگوں کو بھی ہماری طرف متوجہ ہو جانا پڑا

اور ادھر ہم بھی مجبور ہو گئے کہ ان گستاخ لڑکیوں کو قرار واقعی جھڑک دیں لہذا ہمنے غصہ سے بے قابو ہو کر ہکلاتے ہوئے کہا "ب ۔۔ بب ۔۔ بت ۔۔ بد ۔۔ بدتمیزی کی حد ہوتی ہے میں بھی کوئی مس ۔۔۔ مسخرا ہوں ۔۔۔"

وہ لڑکیاں تو خیر میری اس ڈانٹ سے سہم کر دبک رہیں لیکن کسی بدتمیز چار پر آنے والے درجہ کے تھرڈ کلاس آدمی نے کہا "کاٹے گا" اور اسی کیساتھ تمام ہال تالیوں اور قہقہوں سے گونج اٹھا اور ادھر ہم بھی بڑی دھواں دھار تقریر کر رہے تھے لیکن ہم کو خود نہیں معلوم کہ کیا اسلئے کہ خود اپنی آواز سنائی نہ دیتی تھی ہمنے اس شور و غل کو دبانے کیلئے اپنی چھڑی اٹھا کر "آرڈر، آرڈر" کے نعرے بلند کئے مگر اب ہر طرف سے ہمارے علاوہ ہماری چھڑی کی شان میں گستاخیاں شروع ہو چکی تھیں اور آبنوس کا کندا۔ بہرام گھاٹ کا لٹھا، گنوار کا لٹھ وغیرہ وغیرہ نہیں معلوم کیا کیا خطابات اس عالی خاندان چھڑی کو دئے جا رہے تھے بہر حال ہمنے اس موقع پر اس طوفان بے تمیزی سے نکلجانا مناسب سمجھا چنانچہ جسوقت ہم ہال سے باہر آنے کیلئے چلے ہیں تمام ہال تالیوں سے گونج رہا تھا اور قہقہوں سے ایک شور محشر برپا تھا اسکے علاوہ جو آخری آواز ہمنے سنی ہے وہ یہ تھی "آبنوس کا کندا" بہر حال وہ چھڑی ہمارے پاس محفوظ ہے اور اسوقت تک گھر ہی میں رہے گی جبتک کہ تمام دنیا اسکی اہمیت کو نہ سمجھ لے۔

نہ ہوا میں بیوی

واقعی غصہ آنے کی بات بھی ہے۔ ذرا غور تو کیجئے کہ
قدرت نے بیوی کو کتنا بڑا مرتبہ بخشا ہے۔ یعنی وہ بیوی بنا کر پیدا
کی گئی ہے۔ اگر اپنی مرتبہ شناس ہو جائے اور اپنے اقتدار سے
سمجھ بوجھ کے ساتھ کام لینا شروع کر دے تو شوہر نامدار کو دو ہی
دن میں قدرِ عافیت معلوم ہو جائے۔ مگر بیوی اور سمجھ بوجھ یہ
دونوں وہ خطوط متوازی ہیں جن کے متعلق یہ بات کچھ مقدر
ہو چکی ہے کہ یہ کبھی آپس میں نہیں مل سکتے، یوں آپ غصہ بھی
کریں گی، اپنے اختیارات سے کام بھی لیں گی، سارا گھر سر پر اُٹھا
لیں گی، شوہر کی زندگی حرام کر دیں گی مگر نہایت معمولی معمولی
باتوں پر جن کو شوہر کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اب آپ ہی بتائیے
کہ بھلا یہ بھی کوئی بات میں بات ہوئی کہ شوہر کے سینما جانے پر
آپ کو یہ اعتراض ہوا کہ آخر یہ روز کا سینما کیسا۔ اعتراض کی گہرائی

میں ہوتا ہے فلم ایکٹرسوں کا قابل رشک حسن اور اعتراض کی وجہ بیان کی جاتی ہے اقتصادی، کہ آخر جب روز سینما دیکھا جائے گا تو گھر کا خرچ کیونکر پورا پڑے گا۔ شوہر سنتا ہے اور بیوی کے اس غصہ کو غنیمت سمجھ کر کچھ خوشامد، کچھ آئندہ کے متعلق عہد و پیمان اور اگر ان سب سے کام نہ چلا تو کچھ غصہ سے کام لیکر معاملہ کو رفع دفع کر دیتا ہے اس لئے کہ سینما تو دراصل بہانہ ہوتا ہے وہ خدا جانے روز کہاں جاتا ہے اور کہاں سے آکر سینما کا بہانہ کر کے اس طرح سستا چھوٹ جاتا ہے کہ گویا قتل کے مجرم کو پھانسی کے بجائے بید لگا کر چھوڑ دیا جائے اب بتائیے کہ مجرم اس سزا کو اپنے لئے نعمت سمجھیگا یا نہیں، اور جج صاحب کی یہ حماقت اس کے لئے کتنی بڑی دولت ثابت ہوگی۔

تو صاحب اس دولت سے خداوند کریم نے ہم کو مالا مال کر رکھا ہے اور اس مالک کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ ہم کو ہمیشہ پھانسی کی جگہ قتل کے جرم میں کبھی تابرخاست عدالت یا محض تنبیہہ کی سزا ہو جاتی ہے اور ہماری عدالت آج تک مجرم تو خیر ہم کو تسلیم کرتی ہے مگر جرم کی سنگین نوعیت کو سمجھنے سے قاصر رہی ہے۔ فرض کر لیجئے کہ دفتر

سے تنخواہ لیکر چلے راستہ میں بیٹھ گئے' برج کھیلنے آدھی رات تک برج کا سلسلہ جاری رہا اور اب جو اٹھے ہیں تو معلوم ہوا کہ آدھی سے زیادہ تنخواہ برج کے نذر ہو چکی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ آدھی تنخواہ کا یہ مبارک مصرف اگر من و عن بیوی کو معلوم ہو جائے تو ایک شوہر کا کیا حشر ہونا چاہیئے مگر ہوتا یہ ہے کہ شوہر ٹھہرا افسانہ نگار گھر پہنچتے پہنچتے نصف تنخواہ کے مصرف کے متعلق ایک کہانی تیار کر لی اور اس یقین کے ساتھ کہ اور چاہے جو کچھ بھی الزام تھپ جائے مگر بیگم صاحبہ کے ذہن رسا سے یہ امید تو قوی ہے کہ اصل حقیقت کا علم ان کے فرشتوں کو بھی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ گھر پہنچتے ہی وہاں تو شروع ہوئی باز پرس' دیر میں گھر پہنچنے اور سارا دن غائب رہنے کے متعلق اور افسانہ نگار نے یہیں سے اپنی کہانی کا پلاٹ مربوط کر لیا انھوں نے کہا:۔

"اب بھی بیکار ہی آئے جہاں سارا دن اور آدھی رات گزاری ہے وہیں باقی رات بھی بسر ہو سکتی تھی' گھر گیا موا چولھے بھاڑ میں' تنخواہ ملی ہوگی نا پہونچے ہوں گے اسی موے بائسکوپ میں'

ایک بائسکوپ کا تماشہ دیکھا ہوگا چھ بجے سے نو بجے تک، دوسرے بائسکوپ میں نو بجے سے بارہ بجے تک رہے ہوں گے، گھر گیا مواچولھے بھاڑ میں۔"

شوہر نے منھ سکھا کر ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ کہا:۔

"تنخواہ ہی کون سی ایسی ملی ہے جس میں یہ شوق بھی پورے کئے جاتے۔ یہاں تو یہ فکر ہے کہ یہ مہینہ کیسے گزرے گا اور اُڑا رہی ہیں بائسکوپ کی۔ بس اب مہینہ بھر کے لئے بائسکوپ اور سب کچھ گیا بلکہ میں تو سوچ رہا ہوں کہ کل ہی استعفیٰ دیدوں، اُوئے ہاں روز کا یہی قصّہ ہے۔ محنت تولیں گے صاحب بیلوں کی طرح مہینہ بھر اور تنخواہ میں ہوگی یہ کتر بیونت باز آئے ہم ایسی نوکری سے۔"

بس بیوی صاحبہ کا تمام جوش و خروش ختم اور آواز کا وہ رعب بھی غائب، نہایت دھیمی اور سہمی ہوئی آواز میں بولیں:۔

"کیا بات کیا ہے آخر؟"

شوہر نے اپنی زندگی سے عاجز آنے کی اداکاری کا کمال صرف کرتے ہوئے کہا:۔

"بات کیا ہوئی۔ ستارہ ہی کچھ ایسی گردش میں ہے کہ سوچو کچھ ہوتا کچھ ہے۔ ابکی ارادہ تھا کہ تنخواہ مل جائے تو چسٹر بنوالیں گے، وہاں تنخواہ ملی ہے آدھی سے بھی پانچ روپیہ کم۔ کرے داڑھی والا اور پکڑا جائے مونچھوں والا۔ نہ معلوم کس کمبخت نے خدا غارت کرے اُس کو سرکاری خزانہ سے پانچہزار غائب کر دئیے ہیں اب یا تو وہ رقم سب اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر پوری کریں ورنہ پورا عملہ کھنچا کھنچا پھرے اور نوکری سب کی الگ جائے، بڑے صاحب بھی ٹھہرے افیونی اپنی آدھی تنخواہ دیکر حکم دیدیا کہ سب اپنی اپنی آدھی تنخواہ دیکر اس رقم کو پورا کریں اس کے بعد بھی وہ رقم پوری نہ ہوئی تو میری تنخواہ سے پانچروپیے اور لئے گئے"۔

بیوی نے کہا:۔ "یہ آخر تم ہی پر کیا ٹھیکہ تھا کہ پانچروپیہ جو کم پڑے وہ تم ہی سے لئے گئے"۔

شوہر نے جھنجھلا کر کہا:۔ "یہ کون کمبخت کہہ رہا ہے، ارے صاحب آدھی تنخواہ کے بعد بھی دو سو ستّر روپے کم پڑ رہے تھے اب جو حصّہ رسد کمی کی گئی تنخواہوں میں تو مجھے پانچ اور دینا

پڑے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مہینہ کیونکر گزرے گا اور ہوگا کیا۔ بہرحال یہ تو میں طے ہی کر چکا ہوں کہ کل ہی استعفیٰ دیتا ہوں"۔

ظاہر ہے کہ تنخواہ کی اس کتر بیونت کا براہ راست اثر بیوی ہی پر ہونا چاہیئے تھا اس لئے کہ اسی غریب کو مہینہ بھر اسی رقم میں سارا خرچ چلانا تھا مگر چونکہ شوہر صاحب اپنی زندگی سے بیزار بیٹھے تھے اور ملازمت سے علیحدہ ہونے کی بھی ٹھان چکے تھے لہذا بیوی کیلئے سوائے اسکے اور چارہ کار ہی کیا تھا کہ وہ اپنی پریشانی کو اپنی ہی زبان میں چولھے بھاڑ میں ڈال کر شوہر کو تسلی تشفی دے ورنہ خدا جانے وہ کیا کر گزرے لہذا بیوی نے کہا:۔

"نوکری میں تو یہ لگا ہی رہتا ہے۔ چسٹر ابکی نہ سہی اگلے مہینے بنوا لینا یا وہ روپیہ لے لو جو میری گھڑی کیلئے رکھا ہے مجھے اگلے مہینہ دیدینا۔ آخر اتنی پریشانی کی کون سی بات ہے"۔

لیجئے قصہ ختم۔ اب نہ تنخواہ کی حساب فہمی کی ضرورت رہی نہ دیر میں آنے کے سلسلہ میں لکچر سننا پڑا اور نہ کچھ بلکہ اگر تھوڑی سی بیچیائی لادلی جائے تو چسٹر بھی ملتا ہے مگر عاقبت اندیش شوہر ہی

کرتے ہیں کہ جسٹر کے سوال کو گول کر جاتے ہیں۔

یہ ایک موٹی سی مثال ہے ورنہ اس قسم کے اور اکثر اس سے بھی زیادہ سنگین واقعات روز ہوا کرتے ہیں اور بیوی کی سادہ لوحی سے امید ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ ہر مشکل آسان ہوتی رہے گی۔ آخر معلوم نہیں کیوں بیوی کی اس سادہ لوحی پر کچھ ترس سا آرہا ہے اور اپنی زیادتیاں ایک ایک کرکے یاد آرہی ہیں ضمیر چونکہ بقید حیات ہے لہٰذا بار بار ہر واقعہ کی یاد کے ساتھ ہی خیال آرہا ہے کہ افسوس نہ ہوا میں بیوی ورنہ چکھا دیتا مزہ اپنے ایسے شوہر کو جیسا کہ خود میں ہوں اور دو ہی دن میں نہ توبہ بلوا لیتا تو آپ جب ہی کہتے۔ آپ یہاں یہ سوال کر سکتے ہیں کہ آخر بیوی بن کر جناب کیا تیر مار لیتے۔ اس سوال سے قبل ہی میں جواب دئے دیتا ہوں۔

مجھے اپنے شوہر سے دیر میں آنے کی شکایت تو جب ہوتی کہ ان کی واپسی کے وقت میں گھر پر ملتی۔ مگر میں تو دراصل ان سے بھی دیر میں گھر پہنچتی تاکہ یہ شکایت وہ خود مجھ سے کریں اگر وہ عقلمندی سے کام لیکر اس ذکر کو ٹال جاتے تو خیر ورنہ ان کی شکایت انہی کے

منھ پر مارتی کہ ؎

مرے چاک گریباں پر تو تم پھر بعد میں ہنسنا
ہنسے گی تم پہ دنیا تم خبر لو اپنے داماں کی

ان کی اس شکایت کے جواب میں ان کی ایسی خبر لیتی اور ان کی تمام غیر حاضریوں کو اس اس طرح گنواتی کہ مزاج درست ہو جاتا اور اگر وہ شکایت نہ کرتے تو اپنے طرز عمل سے ان کو گھیر گھیر کر شکایت کرنے پر مجبور کرتی۔ بہر حال ان کو اس بات کا اندازہ کرائے بغیر نہ رہتی کہ وہ تو فتنہ ہی تھے مگر بیوی کو بھی قیامت بننا آتا ہے اور اگر انھوں نے اپنی جلد تر اصلاح نہ کرلی تو بیوی میں بھی اتنا دم ہے کہ وہ ناقابل اصلاح بن کر ان کی زندگی صحیح معنوں میں حرام کردے۔ مرد میں جو فطری کمزوریاں ہوتی ہیں انکا صحیح اندازہ عورت کو ذرا کم ہی ہوا کرتا ہے مثلاً مرد کی ایک کمزوری یہ ہے کہ وہ عورت کی طرف سے اپنے کرتوتوں کے انتقام کی تاب کبھی نہیں لاسکتا وہ اپنے لئے تو اس بات کا قائل ہے کہ ہر اچھی صورت پر ہمیشہ بری نظر ڈالو لیکن اگر بیوی کی طرف سے اس قسم کا شبہ بھی خدانخواستہ

ہو جائے تو اس کو اپنی ناک کے متعلق ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ گویا
یہ جڑیں چھوڑ رہی ہے اور کسی دن منہ دھوتے ہوئے طشت میں
آ رہے گی اچھی صورتوں پر بُری نظر ڈالنا اُس کی تو روزمرہ کی تفریح
ہوتی ہے مگر عورت کے متعلق یہ وہم و گمان بھی اسقدر سنجیدہ اسقدر
اہم اور اسقدر خطرناک ثابت ہوتا ہے کہ مرد صاحب کو ان کی غیرت
اور حمیت نہ جانے کیا کیا مشورہ دینے لگتی ہے۔ دراصل اس سلسلہ
میں مردوں کو عورتوں کی طرف سے کوئی سبق نہیں پڑھایا جا سکتا اگر
صاحب نہ ہوا میں بیوی میں تو یہاں بھی نہ چوکتا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے
کہ میں تو یہاں بھی نہ چوکتی۔ کسی نہ کسی دن شوہر صاحب کو عین اُس
وقت جب کہ وہ کوئی نامۂ محبت لکھ رہے ہوتے میرے نام یا میری
طرف سے کسی کو کوئی اسی قسم کا نامۂ شوق اپنی میز پر ملجاتا اور پھر میں
دیکھتی صاحب بہادر کا ناچ۔ ان کو اپنی دنیا تاریک نظر آتی وہ شرم
کے مارے جان دیدینے کی ٹھان لیتے۔ اُن پر کھانا پینا حرام
ہوجاتا اور جناب آتشباز کو اپنے ہی گھر میں لگی ہوئی آگ کا تماشہ
عجیب حسرت بھری نظروں سے دیکھنا پڑتا۔ پھر وہ ایک پسپائی کے

انداز میں خوبصورت الفاظ کے مجموعہ کو اثر میں ڈبو کر اور خون حسرت سے رنگین بنا کر میرے سامنے پیش کرتے کہ تم نے میری وفاؤں کا یہ صلہ مجھ کو دیا ہے۔

میں ایک ٹھنڈی سانس لیکر جواب دیتی کہ :-

"میں بھی انسان ہوں۔ عورت صرف محبت کی بھوکی ہوتی ہے اگر میرے مقدر میں تمہاری محبت ہوتی تو مجھ کو یہ بھیک نہ مانگنا پڑتی مگر تمہاری محبت دوسروں کے لئے ہے تم میرا حق دوسروں پر تقسیم کر رہے ہو اور میں اپنی اس حق تلفی کو مدتوں سے دیکھ رہی ہوں آخر مجھ کو بھی محبت کی جستجو ہوئی۔ بیشک یہ میرا قصور ہے۔ مگر میرے اس قصور کو تم ہی نے پروان چڑھایا ہے"۔

اے جناب میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اگر کوئی بیوی ان الفاظ اور اس جراءت کے ساتھ ایک مرتبہ بھی اپنے منھ زور سے منھ زور شوہر کو اس کے طرز عمل کا جواب دیدے تو خود بدولت کی ساری اکڑ دمیں پر ختم ہو جائے اپنا معاشقہ ایسا بھولیں کہ پھر بھول کر بھی دل کو اپنے سینہ سے کسی طرف نہ کھسکنے دیں۔

آپ کہیں گے کہ یہ جواب غیر فطری ہے۔ عورت کی تقدیس اس پست انتقام کی کبھی روادار نہیں ہو سکتی اور نہ اس انتقام کو کوئی غیرت دار مرد برداشت کر سکتا ہے۔ تو جناب عرض یہ ہے کہ آپ اس پلاٹ کو واقعہ ہی کیوں سمجھیں، یہ تو شوہر کو دھمکانے والا ایک ہُوّا ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ اگر اس انتقام پر شوہر صاحب کی حمیت کوئی خطرناک پہلو اختیار کرنے لگتی یا ان کی ہٹ دھرمی اس موقع پر بھی زیادتی بنجاتی تو میرا چھوٹا بھائی بلکہ بھائی بھی نہیں یہ کہئے کہ دیور ہنستا ہوا۔ ہنسی کے مارے قلابازیاں کھاتا ہوا کرٹن کے پیچھے سے نکل آتا کہ "واہ بھائی جان واہ۔ میرا خط تک آپ نہ پہچان سکے" اس وقت میرے دیور کے بھائی جان صاحب کا جو حلیہ ہوتا میں کوشش کرتی کہ اس کی تصویر لے لوں تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ اس لطیفہ کے باوجود ان کو یعنی میرے صاحب بہادر کو وہ گہرا سبق ملتا کہ زندگی بھر یاد کرتے، ہیجے اور یعنی مشکل ہی سے بھولتے اس کرب کو جو اپنے مفروضہ رقیب کے نام یا اپنے مفروضہ رقیب کا خط دیکھ کر ان کو ہوا تھا۔

شوہر کو سبق دینے کے طریقے ہوا کرتے ہیں یہ، نہ کہ منہ پُھلا کر شروع کر دئیے طعن کہ "اے تم سے چھوٹ چکیں وہ بیگم صاحبہ۔ جیسے اُس کلموہی نے میرا گھر اُجاڑا ہے اللہ کرے اُسے بھی کبھی سُکھ نصیب نہ ہو وہ بھی یوں ہی نصیبوں کو روئے"۔

اس قسم کے مواقع پر شوہر پر کوئی اثر کبھی نہیں ہوتا بلکہ وہ تھوڑا کانوں سے یہ دھواں دھار تقریر سنتا ہے اور منہ سے کوئی ٹھمری یا دادرا یا کسی خیال کے بول گنگناتا رہتا ہے تاکہ یہ ناخوشگوار وقت آسانی سے کٹ جائے۔ بیوی صاحبہ سمجھتی ہیں کہ انھوں نے خوب خبر لی مگر اس بیل کو اپنے سینگ پر بیٹھی ہوئی مکھی کی اطلاع تک نہیں ہوتی۔ مختصر یہ کہ پھر یہی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ:۔

افسوس نہ ہوا میں بیوی

تمام شد

تبسم

(دوسرا ایڈیشن)

یعنی

ہندوستان کے مقبول ترین مزاح نگار ادیب اور سنجیدہ ظرافت میں صاحب طرز انشا پرداز

حضرت شوکت تھانوی

کے اُن بائیس شاہکاروں کا مجموعہ جنہیں کا ہر مضمون مزاح لطیف کا ایک معیار تسلیم کیا گیا ہے۔ پہلا اڈیشن ختم ہونے کے بعد مصنف کی نظر ثانی اور متعدد

جدید مضامین کے اضافہ کے ساتھ

جن سے مزاح نگار کے قلم کی شوخیوں میں ترقی اور مزاح کی شیرینی میں واقعات کی تلخی چھپانے کا اندازہ نہایت آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

قیمت مجلد دو روپیہ (عہ)

ملنے کا پتہ :- صدیق بک ڈپو۔ لکھنؤ

مولانا شوکت تھانوی

کی

مندرجہ ذیل کتابیں تیار ہیں

بڑھبس عہ/	خانم خاں عہ/	دل پھینک عہ/	سوتیا چاہ عہ/
دنیائے تبسم عہ/	سیلاب تبسم عاعہ/	بحر تبسم عاعہ/	موج تبسم عاعہ/
منشی جی حصہ ۱ عہ/	منشی جی حصہ ۲ (زیر طبع) عہ/	منشی جی حصہ ۳ (زیر طبع) عہ/	گہرستان عہ/

نوٹ

ان میں سے گہرستان دیوان ہے باقی سب کتابیں مزاحیہ ہیں

ملنے کا پتہ

صدیق بک ڈپو۔ لکھنؤ